سفید قلعہ
اورحان پامُک
ترجمہ: محمد عمر میمن

اس کتاب کی سافٹ کاپی ہماری مادرِ علمی

کے نام

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستو کے لیے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

ہماراواٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زیل میں ہیں

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارے واٹس ایپ گروپ میں شامل ہونے کے لیے

محمد ذولقرنین حیدر03123050300

پروفیسر سدرہ ریاض صاحبہ03340120123

محمد ثاقب ریاض03447227224

انتساب

نیلگوں دارِون اوگلو
(محبت کرنے والی بہن)
کے لیے
(۱۹۶۱ تا ۱۹۸۰)

Safaid Qila
Orhan Pamuk
White Castle
Translated from English by
Muhammad Umar Memon

پہلی اشاعت : ۲۰۰۷ء
کمپوزنگ : احمد گرافکس، کراچی
طابع : طالب ایچ کھوکھر پرنٹرز، کراچی

بی۔۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
info@scheherzade.com
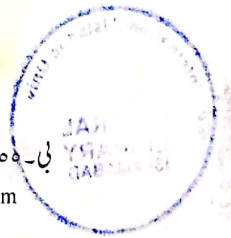
یہ تصور کرنا کہ جو شخص ہمارے تجسس کو
ابھارتا ہے اس کی رسائی ایسے طرزِ زیست تک ہے جو نہ
صرف نامعلوم ہے بلکہ اپنے اسرار کی وجہ سے
پرکشش بھی، یہ یقین کرنا کہ ہم صرف اسی شخص
کی محبت کے ذریعے زندہ رہنے کا آغاز کریں گے — یہ
اگر ایک شدید جذبے کی پیدائش نہیں تو اور کیا ہے؟

مارسیل پروست،
ی۔ک۔ کرا عثمان اوگلو کے غلط ترجمے سے

فہرست

پیش لفظ

یہ مخطوطہ ۱۹۸۲ میں میرے ہاتھ آیا، اس فراموش کردہ ''دستاویز گھر'' میں جو گیزے میں گورنر کے دفتر سے متصل تھا، جہاں ہر گرما میں ہفتہ بھر چھان بین کیا کرتا تھا، ایک خاک آلود صندوق کی تہ میں جو شاہی فرامین، ملکیت کے وثائق، عدالتی دفاتر اور ٹیکس کے پلندوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس کی خوابناک نیلے رنگ کی نازک، ابری دار جلد بندی، اس کی چمکدار کتابت، جو رنگ اڑے حکومتی وثیقوں میں جگ مگ کررہی تھی، فوراً میری نظر میں کھب گئی۔ لکھائی کے فرق سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اس کے حقیقی خطاط کے علاوہ کسی اور شخص نے بعد میں، گویا میری دلچسپی کو مزید ہوا دینے کے لیے، کتاب کے پہلے صفحے پر یہ عنوان ٹانک دیا تھا: ''رضائی بنانے والے کا سوتیلا بیٹا'' کوئی اور تحریر نہیں تھی۔ حاشیے اور خالی صفحے ایسے لوگوں کی تصویروں سے پُر تھے جن کے سر چھوٹے تھے اور ان پر بٹن جڑے سر پوش تھے، اور جو کسی طفلانہ ہاتھ کی صنّاعی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کتاب فوراً پڑھ ڈالی، بے حد لطف کے ساتھ۔ خورسند، لیکن قلمی نسخے کو نقل کرنے کے معاملے میں خاصہ کاہل، میں نے اسے چرا لیا، اس کوڑا گھر سے جسے نوجوان گورنر بھی ''دستاویز گھر'' کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا، نگراں کے اعتماد سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے جو کچھ اتنا مؤدب نکلا کہ میری نگرانی کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس کی، اور، پلک جھپکتے میں، اسے اپنے بستے میں سرکا دیا۔

شروع میں مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ اس کتاب کا کیا کروں گا، سوائے اس کے کہ اسے بار بار پڑھوں۔ اس زمانے میں تاریخ سے میری بے اعتمادی ہنوز مستحکم تھی، اور میں کہانی پر فی نفسہٖ ارتکاز کرنا چاہتا تھا، بجائے مخطوطے کی سائنسی، ثقافتی، بشری، یا ''تاریخی'' قدر و قیمت کے۔ مجھے خود مصنف میں کشش نظر آئی۔ چونکہ مجھے اور میرے احباب کو دانش گاہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا، میں نے اپنے دادا کا قاموس نویس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا: تبھی مجھے مشاہیر سے متعلق ایک قاموس کے حصۂ تاریخ میں — جو میرے حوالے کیا گیا تھا — ایک یادداشت مصنف کے بارے میں بھی شامل کرنے کا خیال آیا۔

اس کام کے لیے میں نے اپنا وہ وقت وقف کر دیا جو قاموس پر کام کرنے اور پینے پلانے سے بچ رہتا تھا۔ جب میں نے مصنف کے زمانے سے متعلق مآخذ سے رجوع کیا، مجھے فوراً نظر آ گیا کہ کہانی میں بیان کیے گئے کچھ واقعات کی امرِ واقعہ سے مطابقت نہ ہونے کے برابر تھی: مثال کے طور پر، میں نے تصدیق کی کہ ان پانچ برسوں میں جب کُپرُولو نے وزیرِاعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا، ایک موقعے پر ایک ہولناک آگ لگی جس نے استنبول کو تباہ کر دیا تھا، لیکن کسی قابلِ اندراج وبا پھوٹنے کی مطلق کوئی شہادت نہیں ملتی تھی، چہ جائیکہ طاعون کی جیسا کہ کتاب میں دکھایا گیا تھا۔ اس دور کے بعض وزیروں کے نام کے ہجّے غلط دیے گئے تھے، کچھ ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیے گئے تھے، اور کچھ کے تو نام تک بدل دیے گئے تھے۔ شاہی نجومیوں کے نام محل کی یادداشتوں میں مندرج ناموں سے مختلف دیے گئے تھے، لیکن میرے خیال میں چونکہ اس عدمِ توافق کا کہانی میں اپنا مقام تھا، میں نے اس پر بہت زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ دوسری طرف، ہماری تاریخ کے ''علم'' سے کتاب میں مندرج واقعات کی عام طور پر تصدیق ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو یہ ''صداقت'' مجھے حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلوں میں بھی نظر آئی: مثلاً، مؤرخ نعیمہ نے شاہی منجم حسین افندی کی سزائے موت اور محمد چہارم کے ہِرا ہُو رمحل

میں خرگوشوں کے شکار کی مہم مِن و عَن بیان کی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ مصنف، یہ بالکل واضح ہے کہ وہ پڑھنے اور ہوائی قلعے بنانے سے لطف اندوز ہوتا تھا، ان مآخذ اور بہت سی دوسری کتابوں سے واقف رہا ہو — جیسے یورپی سیاحوں اور آزاد کردہ غلاموں کی ذاتی یادداشتیں — اور انھیں سے اپنی کتاب کا مواد نکالا ہو۔ اس نے محض ایولیا چیلیبی کی سیاحتوں کے روزنامچے پڑھے ہوں، جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اس سے واقف ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس کا الٹ بھی درست ہو سکتا ہے، میں اپنی کہانی کے مصنف کا پتا لگانے کی کوشش کرتا رہا، لیکن استنبول کے کتب خانوں میں جو تحقیق میں نے کی اس سے میری زیادہ تر امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ مجھے ان رسائل اور کتب میں سے ایک بھی نہیں ملی جو محمد چہارم کو ۱۶۵۲ اور ۱۶۸۰ کے درمیان پیش کی گئی تھیں، نہ توپ کاپہ محل کے کتب خانوں میں، نہ دیگر عوامی یا نجی لائبریریوں میں جہاں میرا خیال تھا کہ وہ بھٹکتے ہوئے پہنچی ہوں گی۔ بس ایک سراغ ملا: کہانی میں مذکور ''چپ دست کاتب'' کی دوسری چیزیں ان کتب خانوں میں دستیاب تھیں۔ کچھ وقت تو میں ان کا تعاقب کرتا رہا، لیکن اطالوی دانش گاہوں سے، جنھیں میں نے اپنی تابڑ توڑ فرمائشات سے تنگ کر مارا تھا، صرف مایوس کن جواب ہی موصول ہوئے؛ مصنف کے نام کی تلاش میں (جو خود کتاب میں دیا گیا تھا، گو عنوان والے صفحے پر نہیں) گیبزے، جنت حصار، اور اوسکُدار کے قبرستانوں میں کتبوں کے درمیان میری سرگردانی بھی ناکام ہی رہی، اور تب تک میں اس سے بھر پایا تھا: میں ممکنہ تفتیشی سراغوں سے دست کش ہوا اور قاموس میں تعارفی مضمون خود کہانی کی بنیاد پر ہی لکھ دیا۔ جیسا کہ مجھے خدشہ تھا، انھوں نے وہ مضمون نہیں چھاپا، لیکن اس وجہ سے کہ اس کا موضوعِ بحث کوئی خاصی مشہور خیال کی جانے والی شخصیت نہیں تھی۔

شاید اسی وجہ سے میرے لیے کہانی کی کشش بڑھ گئی۔ میں نے احتجاجاً استعفا دینے کا خیال بھی کیا، لیکن مجھے اپنا کام اور اپنے رفقا پسند تھے۔ کچھ وقت تو میں ہر ملنے والے کو اپنی کہانی سناتا رہا، اتنے ہی جوش سے جیسے یہ میری ہی تصنیف ہو، نا کہ میری دریافت ہو۔ اسے زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے میں اس کی علامتی قدر و قیمت پر گفتگو کرتا، اس بنیادی ربط پر جو اسے

ہمارے زمانے کی حقیقتوں سے تھا، کہ اس کہانی کے ذریعے کس طرح خود میں اپنے عصر کو سمجھ سکا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جب یہ دعوے کیے، تو نوجوانوں کو جو سیاست، فعّالیت، مشرق ومغرب کے باہمی تعلقات، یا جمہوریت جیسے مسائل میں عام طور پر زیادہ محو ہوتے ہیں، اول اول ان میں کافی کشش نظر آئی، لیکن میرے پینے پلانے کے ندیموں کی طرح، وہ بھی جلد ہی میرے قصے کو بھلا بیٹھے۔ ایک دوست، جو پروفیسر تھا، جس نے صرف میرے اصرار پر مخطوطے کی ورق گردانی کی تھی، بولا کہ استنبول کی عقبی گلیوں کے قدیم چوبی گھروں میں ایسے ہزاروں لاکھوں مخطوطے ہیں جو اسی قبیل کی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر ان مکانوں میں رہنے والے سادہ لوگوں نے انھیں، اپنے عثمانی خط کے باعث، سہواً عربی قرآن سمجھ کر تکریماً اپنی الماریوں کے اوپر نہ رکھا ہوتا تو وہ شاید انھیں صفحہ صفحہ پھاڑ کر اپنے چولہے جلا رہے ہوتے۔

چنانچہ میں نے ایک مخصوص، چشمہ بردار لڑکی کی ہمت افزائی کرنے پر جس کے ہاتھوں سے سگریٹ کبھی جدا نہ ہوتی، کہانی کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا، وہ کہانی جسے میں بار بار پڑھنے کے لیے لوٹتا رہا۔ میرے قارئین دیکھیں گے کہ کتاب کو عصرِ حاضر کی ترکی کے قالب میں ڈھالتے ہوے میں نے اس کے اسلوب کی تربیت کا زعم نہیں کیا ہے: مخطوطے سے، جسے میں ایک میز پر رکھتا، دو ایک جملے پڑھنے کے بعد میں دوسرے کمرے میں ایک دوسری میز پر جاتا جہاں اپنے کاغذات رکھتا تھا، اور اس تاثر کو جو میرے ذہن میں بچ رہتا آج کے محاورے میں بیان کرنے کی کوشش کرتا۔ کتاب کے عنوان کا انتخاب میں نے نہیں کیا ہے، بلکہ اس اشاعت گھر نے جو اسے طبع کرنے پر راضی ہوا۔ شروع میں دیے گئے انتساب کو دیکھ کر قارئین شاید یہ پوچھیں کہ اس کی کیا کوئی ذاتی معنویت ہے۔ میرے خیال میں ہر چیز کو ہر دوسری چیز سے مربوط دیکھنا ہمارے زمانے کی لت ہے۔ چونکہ میں نے بھی اس بیماری کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں، اسی لیے اس کہانی کو شائع کر رہا ہوں۔

فاروق دارون اوگلو

(۱)

ہم کشتی میں سوار وینس سے نیپلز کی طرف جا رہے تھے کہ ترکی بیڑا نمودار ہوا۔ کل ملا کر ہمارے تین جہاز تھے، لیکن کہر سے نکلتی ہوئی ان کی کشتیوں کی قطار کا کوئی انت نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے؛ آناً فاناً ہمارے جہاز پر خوف طاری ہو گیا اور افراتفری مچ گئی، اور ہمارے کشتی بان، جو زیادہ تر ترک اور مور (Moors) تھے، خوشی سے چلانے لگے۔ ہمارے جہاز نے اپنے مستک کا رخ زمین کی طرف، مغرب کی طرف موڑ لیا، جیسے بقیہ دونوں نے، لیکن ان کے برخلاف، ہمارے جہاز کی رفتار میں تیزی نہ آ سکی۔ ہمارا کپتان، اس بات سے خوفزدہ کہ پکڑے جانے پر کہیں عقوبت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے، قیدیوں پر، جو کشتی کھے رہے تھے، کوڑے برسانے کا حکم نہ دے سکا۔ بعد کے سالوں میں مجھے اکثر یہ خیال آیا کہ بزدلی کے اس لمحے نے میری پوری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔

لیکن اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہمارا کپتان خوف سے اچانک مغلوب نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی میری زندگی بدل جاتی۔ بیشتر لوگ اس کے قائل ہیں کہ کوئی زندگی بھی پیشگی متعین نہیں ہوتی، کہ تمام کہانیاں بنیادی طور پر اتفاقات کا ایک سلسلہ ہوتی ہیں۔ تاہم، وہ بھی جو اس پر اعتقاد رکھتے ہیں، جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ واقعات جنھیں انھوں

نے اتفاق سمجھا تھا اصلاً ناگزیر تھے۔ میں اِس لمحے اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں، اس وقت جب میں ایک پرانی میز کے پاس بیٹھا اپنی کتاب لکھ رہا ہوں، چشمِ تصور سے بھوت پریتوں کی طرح کہرے سے ابھرتی ہوئی ترکی کشتیوں کے رنگوں کو دیکھتا ہوں؛ یہ قصہ سنانے کا بہترین وقت معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے کپتان کی یہ دیکھ کر ڈھارس بندھی کہ بقیہ دو کشتیاں ترکی کشتیوں سے بچ نکل کر کہرے میں غائب ہوگئی ہیں، اور بالآخر اس نے کشتی رانوں کی زدوکوب کی جرأت کر ڈالی، لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا؛ ایک بار جب آزادی کا جوش ان میں مشتعل ہوگیا تھا، کوڑوں کی کوئی مار بھی غلاموں کو اطاعت گزاری پر مجبور نہیں کرسکتی تھی۔ دھند کی حوصلہ شکن دیوار کو رنگ برنگے لہریوں میں کاٹتی ہوئی، دس سے بیش ترکی کشتیاں اچانک ہم پر آدھمکیں۔ انجام کار، اب جاکر ہمارے کپتان نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا، اس بات کی کوشش کہ غنیم کو نہیں، بلکہ میرا خیال ہے خود اپنے خوف اور ندامت کو مغلوب کرسکے؛ اس نے غلاموں پر نہایت بے رحمی سے کوڑے برسوائے اور توپوں کو تیار رکھنے کا حکم دیا، لیکن جنگ کا جذبہ، جس کو بھڑکنے میں اتنی تاخیر ہوئی تھی، اتنی ہی زود رفتاری سے بجھ بھی گیا۔ ہم گولا بارود کی تابڑتوڑ یورش میں آگئے—اگر ہم نے فوری ہتھیار نہیں ڈال دیے تو ہماری کشتی کا غرقاب ہونا یقینی تھا— ہم نے سپراندازی کا سفید جھنڈا بلند کردیا۔

جب ہم پرسکون سمندر پر ترکی کشتیوں کے ہمارے پہلو بہ پہلو آجانے کا انتظار کر رہے تھے، میں اپنی کیبن میں آیا کہ اپنی چیزوں کو ٹھیک ٹھاک سے رکھوں، گویا اپنے جانی دشمنوں کا نہیں، جو میری پوری زندگی بدل کر رکھ دیں گے، بلکہ چند دوستوں کی آمد کا متوقع ہوں، اور اپنا چھوٹا سا صندوق کھول کر، خیالات میں گم، اپنی کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوے، جس کی میں نے فلورینس میں بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے؛ مجھے تیز چیخوں، تیزی سے آتے جاتے قدموں، اور باہر ایک مسلسل غل غپاڑے کی آواز سنائی دی، مجھے معلوم تھا کہ کوئی دم جاتا ہے کہ کتاب میرے ہاتھوں سے

جھپٹ لی جائے گی، تاہم میں اس کی بابت نہیں سوچنا چاہتا تھا بلکہ اس کے اوراق پر جو تحریر تھا اس کی بابت۔ ایسا تھا گویا اس کتاب میں جو خیالات، جملے، مساواتِ جبریہ [اکویشنز] تھیں ان میں میری پوری گزشتہ زندگی سمائی ہوئی تھی جس کو کھو دینے سے مجھے خوف آرہا تھا؛ دریں اثنا، میں زیرِ لب اِدھر اُدھر سے جملے پڑھتا رہا، جیسے دعا مانگ رہا ہوں۔ مجھے بڑی شدید خواہش ہو رہی تھی کہ پوری کتاب کو اپنے حافظے پر کندہ کرلوں تاکہ جب وہ آئیں تو میں ان کے بارے میں نہ سوچوں، اور نہ ان مصائب کے بارے میں جو وہ مجھ پر توڑیں گے، بلکہ اپنے ماضی کے رنگوں کو یاد کروں، جیسے کسی کتاب کے بہت ہی مرغوب الفاظ کی بازخوانی کر رہا ہوں جنھیں میں نے شوق سے ازبر کیا ہو۔

اُن دنوں میں ایک مختلف آدمی ہوا کرتا تھا، حتیٰ کہ ماں، منگیتر، اور دوست مجھے ایک مختلف نام سے پکارتے تھے۔ اب بھی کبھی کبھار میں اپنے خوابوں میں اس آدمی کو دیکھتا ہوں جو میں ہوا کرتا تھا، اور جو، جیسا کہ اب میرا اعتقاد ہے، میں تھا، اور پسینے میں شرابور حالت میں بیدار ہوتا ہوں۔ یہ متنفس جو ذہن میں اب اُڑے ہوے رنگوں کا خیال لاتا ہے، ان سرزمینوں کے خواب صفت رنگ جو کبھی تھی ہی نہیں، چرند پرند جن کا سرے سے کبھی وجود تھا ہی نہیں، وہ ناقابلِ یقین ہتھیار جو ہم نے آگے چل کر سال بہ سال ایجاد کیے، تب تیئیس سال کا تھا، اس نے فلورینس اور وَینِس میں ''سائنس اور آرٹ'' کا مطالعہ کیا تھا، یہ فرض کرتا تھا کہ اجرام فلکی، ریاضی، طبیعیات، اور پینٹنگ کے بارے میں کسی قدر علم رکھتا ہے۔ یقینی بات ہے، وہ مغرور تھا: جو کچھ بھی اس کے وقتوں سے پہلے انجام دیا جاچکا تھا اس کو ہڑپ کرچکنے کے بعد ہر چیز پر ناک بھوں چڑھاتا تھا؛ اسے ذرا بھی شک نہ تھا کہ وہ یہ سب بہتر طور پر کرسکتا ہے؛ اس کا کوئی ہمسر نہیں؛ اسے معلوم تھا کہ وہ ہر کسی کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور مولک ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک معمولی سا جوان تھا۔ جب مجھے اپنے واسطے ایک ماضی ایجاد کرنا پڑتا ہے، یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ یہ جوان آدمی جو اپنی محبوبہ سے اپنے جذبوں، اپنے منصوبوں، دنیا اور سائنس کے بارے میں گفتگو کرتا تھا، جسے یہ بالکل فطری معلوم ہوتا تھا کہ اس کی منگیتر اس کی شیدائی ہے، درحقیقت

وہ میں ہی تھا۔ لیکن مجھے اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ جو میں یہاں رقم کررہا ہوں ایک دن معدودِ چند لوگ اسے صبر و تحمل سے آخر تک پڑھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ وہ جوان آدمی میں نہیں تھا۔ اور شاید وہ باصبر قاری یہ سوچیں، جیسا کہ اب میں سوچتا ہوں، کہ اس جوان کی کہانی، جس نے اپنی نایاب کتابیں پڑھنے میں اپنی زندگی گنوادی، بعد میں اس مقام سے جہاں وہ منقطع ہوگئی تھی، جاری ہوگئی۔

جب ترکی کشتی بانوں نے اپنی متحرک سیڑھیاں نیچے گرائیں اور ہماری کشتی کے عرشے پر چڑھ آئے، میں نے اپنی کتابوں کو اپنے صندوق میں ڈالا اور باہر جھانکنے لگا۔ ہماری کشتی پر خاصی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہ سبھوں کو عرشے پر جمع کررہے تھے اور کپڑوں سے الف ننگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ اس گڑبڑ میں میں چاہوں تو پانی میں چھلانگ لگا سکتا ہوں، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ وہ مجھے پانی ہی میں گولی ماردیں گے، یا پکڑ لیں گے اور فوراً مار ڈالیں گے، اور، بہرکیف، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم زمین سے کتنے قریب ہیں۔ شروع شروع میں کسی نے مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ مسلمان غلام، جن کی زنجیریں ڈھیلی کردی گئی تھیں، خوشی کے مارے چلا رہے تھے، اور ان کی ایک ٹولی ان لوگوں سے جنھوں نے انھیں کوڑے مارے تھے فوراً انتقام لینے کی فکر میں لگ گئی۔ جلد ہی انھوں نے مجھے میری کیبن میں پایا۔ اندر آئے، اور میرے اثاثے کی تلاشی لے ڈالی۔ سونے کی تلاش میں میرے صندوقوں کو اتھل پاتھل کرکے رکھ دیا، اور جب میری چند کتابوں اور سارے کپڑوں پر قبضہ کرلیا، کسی نے مجھے دبوچ لیا، جب کہ میں خالی الذہنی سے دو ایک بچی ہوئی کتابوں کے مطالعے میں غرق تھا، اور کپتانوں میں سے ایک کے پاس لائے۔

یہ کپتان، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، جینوا کا رہنے والا تھا جس نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا تھا، تو اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا؛ اس نے میرا پیشہ پوچھا۔ چپّو چلانے سے باز رہنے کی خاطر میں نے جھٹ اعلان کردیا کہ اجرام فلکی اور رات میں کشتی رانی کے راستوں کا علم رکھتا ہوں، لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر میں نے تشریح الابدان کی کتاب پر

بھروسہ کرتے ہوئے جو انھوں نے میرے پاس چھوڑ دی تھی، یہ دعویٰ کیا کہ ڈاکٹر ہوں۔ جب مجھے ایک آدمی دکھایا گیا جس کا ایک بازو نہیں رہا تھا، تو میں نے احتجاج کیا کہ میں جراح نہیں ہوں۔ اس پر انھیں غصہ آ گیا، اور وہ مجھے چپو چلانے پر لگانے ہی والے تھے کہ کپتان نے، میری کتابیں دیکھ کر، پوچھا کہ کیا میں پیشاب اور نبض کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہوں۔ جب میں نے کہا کہ ہاں، تو میری چپوؤں سے جاں بخشی ہوگئی اور اپنی چند اور کتابوں کی بازیابی میں کامیاب ہوگیا۔

لیکن اس رعایت کی مجھے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ دوسرے عیسائی، جو چپو چلانے پر لگائے گئے تھے، فوراً مجھے قابلِ نفرین سمجھنے لگے۔ اگر ان کا بس چلتا تو مجھے جہاز کے نچلے خانے (ہولڈ) میں، جہاں ہمیں رات کے وقت بند کردیا جاتا تھا، مروا ڈالتے، لیکن خوف کے مارے باز رہے، کیونکہ میں نے پلک جھپکتے ہی میں ترکوں سے تعلقات پیدا کرلیے تھے۔ ہمارا بزدل کپتان ابھی ابھی سولی پر اپنی جان سے جاتا رہا تھا، اور انتباہ کے طور پر غلاموں پر کوڑے برسانے والے جہازرانوں کے ناک کان کاٹ دیے گئے تھے، پھر رافٹ پر اتار کر سمندر میں بہا دیا گیا تھا۔ چند ترکوں کا علاج کرنے کے بعد، جس میں میں نے اپنی عقل سلیم سے کام لیا تھا، نہ کہ علم تشریح الابدان سے، اور ان کے زخم بھی از خود مندمل ہوگئے تھے، ہر کوئی مجھے ڈاکٹر سمجھنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ وہ بھی جنھوں نے حسد کے مارے ترکوں کو بتا دیا تھا کہ میں ڈاکٹر واکٹر نہیں ہوں، رات کو ہولڈ میں مجھے اپنے زخم دکھانے لگے۔

ہم بڑی دھوم دھام کے ہجوم میں استنبول میں داخل ہوے۔ یہ کہا گیا کہ طفل سلطان جشن کا مشاہدہ کررہا ہے۔ انھوں نے اپنے علم ہر مستول پر بلند کیے اور ان کے زیریں حصے میں ہمارے جھنڈے، کنواری مریم کی شبیہیں، اور صلیبیں سر کے بل، ڈال دیں تاکہ شہر کے گرم خو، جو عرشے پر چڑھ آئے تھے، ان پر چاندماری کریں۔ توپ کے گولے سارے آسمان پر پھٹ پڑے۔ یہ تقریب، ایسی بہت سی دوسری تقریبوں کی طرح جن کا آنے والے سالوں میں مَیں زمین سے اداسی، تنفر، اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مشاہدہ کرنے والا تھا، اتنی

دیر تک جاری رہی کہ بہت سے تماش بین سورج کی تمازت کے باعث بے ہوش ہوگئے۔ کہیں
شام کے قریب ہم قاسم پاشا میں لنگر انداز ہوے۔ سلطان کی خدمت میں پیش کرنے سے قبل
ہمیں زنجیریں لگا دی گئیں، ہمارے فوجیوں کو ان کی زرہ بکتر تمسخر کے واسطے الٹی پہنوائی، ہمارے
افسروں کی گردنوں کے گرد لوہے کے طوق ڈالے، اور زور زور سے بھونپو (ہورن) اور ترچیاں
(ٹرمپٹس) بجاتے ہوے، جو انھوں نے ہمارے جہازوں سے ہتھیائی تھیں، ادھم مچاتے ہوے،
فتحمندی کے ساتھ، ہمیں محل لائے۔ شہر کے لوگ شاہراہوں پر قطار بنائے کھڑے ہمیں تفریح اور
تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ سلطان نے، جو ہماری نگاہ سے اوجھل تھا، اپنے حصے کے غلام چنے
اور انھیں دوسروں سے الگ کروا دیا۔ وہ ہمیں گولڈن ہورن پار کرا کر ڈونگیوں میں گلتا لائے اور
صادق پاشا جیل خانے میں ٹھونس دیا۔

بندی خانہ بڑی تکلیف دہ جگہ تھی۔ تنگ سی مرطوب کوٹھڑیوں کی غلاظت میں سینکڑوں
قیدی پڑے سڑ رہے تھے۔ مجھے وہاں بیشمار لوگ ملے جن پر میں اپنا نیا پیشہ آزما سکتا تھا، اور میں
نے ان میں سے چند کو صحت یاب بھی کر دیا۔ ان چوکیداروں کے واسطے، جو کمر یا ٹانگوں کے درد
کے شاکی تھے، نسخے بھی لکھے۔ چنانچہ یہاں بھی میرے ساتھ بقیوں سے مختلف سلوک کیا گیا،
مجھے بہتر کوٹھڑی دی گئی جس میں سورج کی روشنی پہنچتی تھی۔ دوسروں پر جو گزر رہی تھی اسے دیکھ
کر، میں نے اپنی صورتِ حال پر شکر ادا کرنے کی کوشش کی، لیکن ایک صبح دوسرے قیدیوں کے
ساتھ ساتھ مجھے بھی اٹھا دیا گیا اور بتایا گیا کہ باہر کام کرنے کے واسطے لیجایا جاؤں گا۔ میں نے
جب احتجاج کیا کہ ڈاکٹر ہوں، جسے سائنس اور طب کا علم آتا ہے، تو وہ ہنسنے لگے: پاشا کے باغ
کے گرد دیواریں بنائی جانے والی تھیں جس کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ ہر صبح طلوعِ
آفتاب سے پہلے ہمیں زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جاتا اور شہر کے باہر لے
جایا جاتا۔ سارا دن پتھر چننے کے بعد جب شام کو، ابھی تک زنجیروں سے ساتھ ساتھ جُڑے، ہم
لشٹم پشٹم اپنے قید خانے لوٹتے، میں غور کرتا کہ استنبول واقعی ایک خوب صورت شہر ہے، لیکن
یہاں آدمی کو آقا، نا کہ غلام، ہونا چاہیے۔

اس کے باوجود میں کوئی معمولی غلام نہیں تھا۔ لوگوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ میں
معالج ہوں، چنانچہ اب میں صرف قید میں سڑتے غلاموں ہی کی نہیں بلکہ اوروں کی بھی دیکھ رکھ
کر رہا تھا۔ علاج سے جو معاوضہ ملتا تھا اس کا ایک بڑا حصہ مجھے چوکیداروں کو دینا پڑتا جو مجھے
خفیہ طور پر باہر نکال لاتے تھے۔ وہ رقم جو میں ان سے چھپانے میں کامیاب ہو جاتا، اسے میں
ترکی زبان سیکھنے پر خرچ کرتا تھا۔ میرا معلم ایک خوشگوار، عمر رسیدہ آدمی تھا جس کے ذمے پاشا
کے چھوٹے موٹے کاموں کی نگہداشت تھی۔ اسے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہ میں ترکی زبان
سیکھنے میں کافی چست ہوں، اور وہ یہ بھی کہتا کہ میں جلد ہی مسلمان ہو جاؤں گا۔ مجھے ہر سبق کے
بعد پڑھانے کا معاوضہ قبول کرنے کے لیے اس کو باقاعدہ مجبور کرنا پڑتا تھا۔ میں اسے اپنے
واسطے کھانا لانے کے لیے بھی پیسے دیتا، کیونکہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی پوری دیکھ بھال
کروں گا۔

ایک کہر آلود شام ایک افسر میری کوٹھڑی میں آیا اور کہا کہ پاشا مجھ سے ملنے کا خواہشمند
ہے۔ متعجب اور ہیجان زدہ، میں فوراً تیار ہو گیا۔ میں نے خیال کیا ہو نہ ہو پیچھے گھر میں میرے
کسی باوسائل رشتے دار نے، شاید میرے باپ، شاید میرے مستقبلی خسر نے، میرا تاوان ادا
کرنے کے واسطے رقم بھیجی ہے۔ دھند میں پیچ کھاتی، تنگ سی گلیوں سے ہو کر گزرتے ہوے مجھے
یہ لگا کہ اچانک اتفاقیہ اپنا گھر نظر آ جائے گا یا اپنے پیاروں کے بالکل سامنے پہنچ جاؤں گا جیسے
کسی خواب سے بیدار ہو رہا ہوں۔ شاید وہ میری رہائی کی گفت وشنید کے واسطے کسی کو بھیجنے میں
کامیاب ہو گئے تھے، شاید آج رات ہی اسی دھند میں مجھے ایک جہاز پر سوار کر کے گھر روانہ کر
دیا جائے گا۔ جب میں پاشا کی حویلی میں داخل ہوا تبھی مجھ پر واضح ہوا کہ میرا آزاد ہونا اتنا
آسان نہیں۔ لوگ یہاں پنجوں کے بل چل رہے تھے۔

پہلے وہ مجھے ایک لمبی سی راہداری میں لائے جہاں مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑا
جب تک کہ مجھے ایک کمرے میں نہیں لے جایا گیا۔ ایک چھوٹے سے دیوان پر کمبل کے نیچے
ایک مختصر سا خوش اخلاق آدمی پسرا ہوا تھا۔ ایک اور آدمی، بڑا ہٹا کٹا، اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔

پسرا ہوا آدمی پاشا تھا، جس نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے باتیں کیں۔ اس نے مجھ سے کئی سوال کیے۔ میں نے بتایا کہ میرے مطالعے کے اصلی موضوعات فلکیات، ریاضی، اور ان سے کم تر درجے پر، انجینئری رہے ہیں، لیکن مجھے طب کا علم بھی ہے اور میں نے بہت سے مریضوں کا علاج کیا ہے۔ وہ مجھ سے سوالات کرتا رہے اور میں اس کو کچھ اور بتانے ہی والا تھا کہ اس نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر میں نے ترکی اتنی سرعت سے سیکھ لی ہے تو یقیناً ذہین آدمی ہوں گا، یہ اضافہ کیا کہ اسے کوئی بیماری ہے جس کا علاج دوسرے ڈاکٹروں میں سے کوئی بھی نہیں کر سکا ہے، اور کہ میرے بارے میں سن کر، وہ میری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔

اس نے اپنے عارضے کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گیا کہ عوام الناس کے اس پاشا کو جو بیماری لاحق ہے روئے زمین پر نایاب ترین ہے، کیونکہ اس کے دشمنوں نے افترا پردازی سے خدا کو دھوکا دیا ہے۔ لیکن اس کو صرف ہانپنے کا عارضہ تھا۔ میں نے اس سے تفصیلی سوال کیے، اس کی کھانسی کا معائنہ کیا، پھر باورچی خانے میں جا کر جو کچھ بھی ہاتھ لگا اس سے پودینے کی مہک والی گولیاں تیار کیں۔ میں نے کھانسی کے واسطے راب (سیرپ) بھی تیار کیا۔ چونکہ پاشا کو زہر دیے جانے کا خطرہ رہتا تھا، میں نے اس کے سامنے خود ایک قرص شربت کے ایک گھونٹ کے ساتھ نگلی۔ اس نے مجھے حویلی سے خفیہ طور پر نکلنے کی ہدایت کی، غایت درجے کی احتیاط سے کہ مبادا کوئی دیکھ نہ لے، اور قید خانے لوٹنے کی۔ افسر نے بعد میں بتایا کہ پاشا نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے ڈاکٹروں کے رشک کو ہوا دے۔ اگلے دن میں واپس لوٹا، اس کی کھانسی کی آواز سنی، اور دوبارہ وہی دوا دی۔ ان رنگین گولیوں سے جو میں نے اس کی ہتھیلی پر رکھ دی تھیں، وہ اتنا ہی خوش ہوا جتنا ایک بچہ ہوتا ہے۔ اپنی کال کوٹھڑی کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے دعا کی کہ وہ صحت یاب ہو جائے۔ اگلے روز بادِ شمالی چل رہی تھی۔ یہ ایک آہستہ رو، خنک ہوا تھی اور مجھے خیال آیا کہ اس موسم میں کوئی شخص بھی روبصحت ہو سکتا ہے، چاہے ایسا اس کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لیکن کوئی خبر نہ ہوئی۔

ایک ماہ بعد جب مجھے بلایا گیا، ایک بار پھر بیچ رات میں، پاشا اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا

تھا اور بشاش تھا۔ جب اس نے چند لوگوں کو ڈانٹا ڈپٹا، تو میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ اسے سانس لینے میں دقت نہیں محسوس ہو رہی۔ مجھے دیکھ کر اسے مسرت ہوئی، بولا کہ اس کی بیماری جاتی رہی ہے، اور کہ میں اچھا ڈاکٹر ہوں۔ میں اس سے کس نوازش کا خواستگار ہوں؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے یکدم آزاد نہیں کرے گا اور گھر جانے دے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی کوٹھڑی کی شکایت کی، اور جیل خانے کی؛ بیان کیا کہ بلاوجہ شدید مشقت سے مجھے نڈھال کیا جا رہا ہے جب کہ اگر مجھے فلکیات اور ادویہ کا شغل کرنے دیا جائے تو اس سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ اس نے اس میں کا کتنا حصہ سنا۔ اس نے پیسوں سے بھری جو تھیلی مجھے دی اس کا بڑا حصہ چوکیداروں نے دھروا لیا۔

ہفتہ بھر بعد ایک افسر رات کے وقت میری کوٹھڑی میں آیا، اور یہ قسم لے لینے کے بعد کہ میں فرار نہیں ہوں گا، میری زنجیریں علاحدہ کر دیں۔ مجھے دوبارہ باہر کام پر لے جایا جانے لگا، لیکن اب غلاموں کے کاموں کے نگراں میرے ساتھ ترجیحی برتاؤ کرنے لگے۔ تین دن بعد افسر میرے واسطے نئے کپڑے لایا اور مجھے احساس ہوا کہ اب میں پاشا کی امان میں ہوں۔

اب بھی مجھے مختلف حویلیوں میں رات کے وقت بلا بھیجا جاتا تھا۔ میں بحری قزاقوں کی، جو گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوتے، دوادارو کرتا، اور دردِ شکم کے شاکی نوجوان فوجیوں کی۔ خارش زدوں کی فصد کھولتا، یا ان کی جن کا رنگ اُڑ گیا ہوتا یا جو سر درد میں مبتلا ہوتے۔ ایک بار، ایک خادم کے ہکلاتے بیٹے کو دوائی شربت پلایا تو ہفتے بھر ہی میں وہ صحتیاب ہو گیا اور مجھ پر نظم لکھ کر سنائی۔

سردیاں اسی طرح گزر گئیں۔ بہار کی آمد پر میں نے سنا کہ پاشا، جس نے ایک مہینے تک مجھے نہیں پوچھا تھا، جنگی بیڑے کے ساتھ بحیرۂ روم پر گیا ہوا ہے۔ گرما کے کھولتے ہوئے دنوں میں جب لوگوں نے مجھے نامراد و مایوس دیکھا تو کہا کہ شکایت کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں، کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر میری اچھی خاصی کمائی ہو جاتی ہے۔ ایک سابقہ غلام نے جو کافی سالوں پہلے مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا مجھے یہ نصیحت کی کہ فرار نہ ہوں۔ یہ لوگ ہمیشہ ہی ایک ایسا

غلام رکھنے کے عادی ہیں، جیسے کہ انھوں نے مجھے رکھا ہوا ہے، جو ان کے لیے کارآمد ہو، جسے وہ کبھی بھی اپنے ملک لوٹنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر میں اسلام لے آؤں، جیسے وہ لے آیا ہے، تو پھر میں آزاد آدمی ہوسکتا ہوں، اس سے بیش نہیں۔ چونکہ مجھے یہ خیال آیا کہ اس نے یہ بات میری ٹوہ لینے کی خاطر کہی ہو، میں نے اسے متنبہ کردیا کہ میری بھاگنے کی بالکل کوئی نیت نہیں۔ یہ بات نہیں کہ مجھ میں خواہش کا فقدان تھا، بلکہ ہمت کا۔ وہ سب کے سب، جو مفرور ہوے تھے، زیادہ دور نہیں جانے پائے تھے کہ دوبارہ پکڑ لیے گئے۔ جب ان بدبختوں کی خوب زدوکوب ہوچکی تو میں نے ہی رات کو ان کی کوٹھڑیوں میں جاکر ان کے زخموں پر مرہم لگایا۔

خزاں کے قریب آتے آتے، پاشا بیڑے کے ساتھ لوٹا؛ اس نے توپوں کے گولوں سے سلطان کا خیرمقدم کیا، شہر کو شادماں کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے سال گزشتہ کیا تھا، لیکن یہ ظاہر تھا کہ انھوں نے یہ موسم عافیت میں بالکل نہیں گزارا۔ وہ صرف چند ہی غلام جیل خانے میں لائے تھے۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اہلِ وَینِس نے چھ کشتیوں کو نذرِآتش کردیا تھا۔ گھر کی خبر حاصل کرنے کے لیے میں غلاموں سے، جن میں زیادہ تر ہسپانوی تھے، گفتگو کرنے کے موقعے کی گھات میں لگ گیا؛ لیکن وہ خاموش، بےخبر، ڈرپوک مخلوق ثابت ہوے جنھیں مدد یا خوراک مانگنے کے علاوہ کوئی اور بات کرنے کی چنداں خواہش نہ تھی۔ ان میں صرف ایک ہی ایسا تھا جس میں مجھے دلچسپی پیدا ہوسکی: اس کا ایک بازو جاتا رہا تھا، لیکن اس نے رجائی انداز میں بتایا کہ اس کے پرکھوں میں سے ایک اسی قبیل کے سوء اتفاق کے تجربے سے گزر کر اپنے باقیماندہ ہاتھ سے شولری کا رومانس رقم کرنے کے واسطے باقی بچ رہا تھا۔ اور خود اس کو یقین تھا کہ ایسا ہی کارنامہ سرانجام دینے کے لیے اس کی جاں بخشی بھی ہوجائے گی۔ آئندہ آنے والے برسوں میں، میں نے زندہ رہنے کے لیے کہانیاں لکھیں، میں نے اس آدمی کو یاد کیا جس نے کہانیاں لکھنے کی خاطر زندہ رہنے کا خواب دیکھا۔ اس کے کچھ ہی بعد جیل خانے میں چھوت کی بیماری پھیل گئی، ایک منحوس وبا جس کے گزرنے سے پہلے آدھے سے زیادہ غلام کھیت رہے، اور جس سے دامن بچانے کی خاطر میں نے چوکیداروں کو رشوتوں سے لاد دیا۔

جو زندہ بچ رہے تھے انھیں نئے منصوبوں پر کام کرنے لیجایا گیا۔ میں نہیں گیا۔ شام کو وہ بتاتے کہ کس طرح وہ گولڈن ہورن کے بالکل سرے تک گئے، جہاں نجاروں، گاہکوں، پینٹرز کی نگرانی میں انھیں مختلف کاموں پر لگایا گیا: وہ کاغذ کی لگدی (papier mâché) کے موڈل — جہاز، قلعے، برج — بنا رہے تھے۔ بعد ازاں، ہمیں اس کا سبب معلوم ہوا: پاشا کا بیٹا وزیرِ اعلیٰ کی بیٹی سے شادی کرنے والا تھا اور وہ ایک بڑی دیدنی تقریبِ شادی کا اہتمام کر رہا تھا۔

ایک صبح مجھے پاشا کی حویلی بلایا گیا، میں گیا، یہ سوچتے ہوے کہ اس کی پرانی دمے کی بیماری لوٹ آئی ہوگی۔ پاشا مصروف تھا، اور مجھے ایک کمرے میں انتظار کرنے کے لیے بھیج دیا گیا، میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ایک اور دروازہ کھلا اور کوئی شخص، مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑا، اندر آیا۔ میں نے اوپر اس کے چہرے پر اچنبھے کے عالم میں دیکھا — ہیبت کے مارے فوراً ہی میری سٹی گم ہوگئی۔

(۲)

میرے اور کمرے میں داخل ہونے والے شخص کے درمیان حیرت انگیز مشابہت تھی! یہ میں ہوں ...اس ثانیے میں نے یہی خیال کیا تھا۔ یوں محسوس ہوا گویا کوئی میرے ساتھ چال چل رہا ہو اور جس دروازے سے میں پہلے داخل ہوا تھا، اس کے مقابل دروازے سے مجھے دوبارہ اندر لایا ہو، یہ کہتے ہوے کہ دیکھو تمھیں حقیقت میں ایسا ہی ہونا چاہیے، تمھیں دروازے سے اس طرح اندر دخل ہونا چاہیے، اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کرنا چاہیے، کمرے میں بیٹھے ہوے دوسرے آدمی کو تمھیں اس طرح دیکھنا چاہیے۔ آنکھیں چار ہوتے ہی ہم نے ایک دوسرے کو سلام علیک کی۔ لیکن وہ متحیّر نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھ سے بہت زیادہ مشابہت نہیں رکھتا، اس کے داڑھی تھی؛ اور مجھے لگا کہ میں خود اپنے چہرے کے خط و خال بھول گیا ہوں۔ جب وہ میرے مقابل بیٹھ رہا تھا، مجھے احساس ہوا کہ آئینے میں آخری بار اپنا چہرا دیکھے مجھے ایک سال ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دروازہ کھلا جس سے میں داخل ہوا تھا اور اسے اندر بلایا گیا۔ انتظار کرتے ہوے مجھے خیال آیا کہ یہ سب میرے پراگندہ ذہن کی کارستانی تھی نہ کہ ہوشیاری سے تیار کیا ہوا کوئی مذاق۔ کیونکہ میں اس زمانے میں ہمیشہ یہی خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا کہ میں گھر

واپس جاؤں گا، سب میرا استقبال کریں گے، کہ وہ مجھے فوراً رہا کر دیں گے، کہ فی الواقع میں اپنے جہاز کی کیبن میں ہنوز محوِ خواب ہوں، یہ سب بس ایک خواب ہے— ایک طرح کے دل کو دلاسا دلانے والے خیالی منظر۔ میں یہ نتیجہ نکالنے ہی والا تھا کہ یہ بھی انھیں جیسا دن سپنا ہے، لیکن وہ جو حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہو، یا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہر چیز آناً فاناً بدل جائے گی اور اپنی پرانی حالت پر پہنچ جائے گی، ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور مجھے اندر آنے کی اجازت ملی۔

پاشا ایستادہ تھا، میرے ہم شبیہہ کے ذرا پیچھے۔ اس نے مجھے اپنی عبا کے کنارے پر بوسہ دینے دیا، اور میں نے یہ قصد کیا کہ جب وہ میری خیر خیریت پوچھے گا، میں اپنی کوٹھڑی کی صعوبتوں کا حال بتا دوں گا، کہوں گا کہ میں اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں، لیکن وہ تو سن ہی نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا پاشا کو یاد تھا کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں سائنس، فلکیات، انجینئری کا علم رکھتا ہوں— تو کیا آسمان پر اچھالی جانے والی آتش بازیوں کے بارے میں بھی مجھے کچھ آتا ہے، بارود کے بارے میں؟ میں نے فوراً کہہ دیا کہ ہاں، لیکن جس لمحے میری آنکھیں دوسرے آدمی کی آنکھوں سے چار ہوئیں مجھے شک گزرا کہ یہ لوگ میرے واسطے کہیں کوئی دام نہ بچھا رہے ہوں۔

پاشا بتا رہا تھا کہ شادی کی تقریب کا جو منصوبہ بنا رہا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہو گا، اور آتش بازی کا تماشا کروائے گا، لیکن ایسا کہ بے نظیر ہو۔ میرے ہم شبیہہ نے، جسے پاشا ''خوجہ،'' بمعنی ''آقا،'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، ماضی میں، سلطان کی ولادت کے موقعے پر، آتش خوروں کے ایک تماشے پر کام کیا تھا جس کا اہتمام مالٹا کے ایک باشندے نے کیا تھا جو اب مر چکا ہے، چنانچہ اسے ان چیزوں کے بارے میں تھوڑا بہت علم ہے، لیکن پاشا کا خیال تھا کہ میں اس کا معاون بن سکوں گا— ہم ایک دوسرے کی تکمیل کر سکیں گے۔ اگر ہم نے اچھا تماشا پیش کیا تو پاشا ہمیں انعام دے گا۔ جب، یہ سوچ کر کہ مناسب وقت آ گیا ہے، میں نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ میری تو بس گھر لوٹنے کی خواہش ہے، پاشا نے مجھ سے پوچھا کہ یہاں

آنے کے بعد سے چکلے کی زیارت بھی کی ہے، اور میرا جواب سن کر کہا کہ اگر مجھے عورت کی خواہش نہیں تو آزادی حاصل کر کے میرا کیا بھلا ہوگا؟ وہ چوکیداروں کی سی غیر شائستہ زبان استعمال کر رہا تھا اور میں ضرور ہکا بکا نظر آ رہا ہوں گا، کیونکہ اس نے خوب دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ پھر وہ اس بھوت کی طرف متوجہ ہوا جسے ''خوجہ'' کہہ کر پکارتا تھا: ساری ذمے داری اس کی تھی۔

ہم لوٹ گئے۔

صبح کو جب میں اپنے ہم شبیہ کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا مجھے خیال آیا کہ میرے پاس اسے سکھانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کا علم بھی میرے علم سے زیادہ نہیں تھا۔ مزید براں، ہمارا اس بات پر اتفاق تھا: سارا مسئلہ صحیح کافوری مرکب کی دریافت کا ہے۔ چنانچہ ہمارا کام یہ ہوگا کہ ناپ تول کر احتیاط سے تجرباتی مرکب تیار کریں، رات کو شہر کے پاس شہر کی بلند فصیلوں کے سایے میں انھیں داغیں، اور جو مشاہدے میں آئے اس سے نتیجے اخذ کریں۔ بچے ہیبت زدہ ہو کر ہمارے کارندوں کو وہ راکٹ چھوڑتے ہوئے دیکھتے جو ہم نے تیار کیے ہوتے، اور ہم تاریکی میں ڈوبے درختوں کے نیچے کھڑے تشویش کے ساتھ نتیجے کا انتظار کرتے، جیسا کہ ہم برسوں بعد دن کے اجالے میں اُس ناقابلِ یقین ہتھیار کی آزمائش کے وقت کرنے والے تھے۔ ان تجربوں کے بعد، کبھی چاندنی میں، کبھی گھور اندھیرے میں، میں اپنے مشاہدات کو ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں رقم کرنے کی کوشش کرتا۔ رات کو جدا ہونے سے پہلے ہم خوجہ کے مکان لوٹتے، جس سے گولڈن ہورن کا منظر دکھائی دیتا تھا، اور بڑی تفصیل سے ان پر بحث کرتے۔

اس کا گھر چھوٹا، دل گھبرا دینے والا، اور دلکشی سے محروم تھا۔ داخلے کا دروازہ ایک بڑی ٹیڑھی میڑھی سڑک پر تھا جو کسی غلیظ چشمے کے بہاؤ سے گدلائی ہوئی تھی، اس چشمے کے مبدأ کا پتا مجھے کبھی نہیں چل سکا۔ اندر، تقریباً کوئی فرنیچر نہیں تھا، اس کے باوجود میں جب بھی اندر آیا، خستگی کے عجیب سے احساس کا دباؤ اور غلبہ ہوا۔ شاید اس کا مرجع اس آدمی کی ذات تھی جو، چونکہ اسے پسند نہیں تھا کہ اس کے داد کے نام پر اس کا نام رکھا جائے، چاہتا تھا کہ میں اسے

''خوجہ'' کہہ کر پکاروں: وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ سیکھنے کا خواہش مند ہو، لیکن کیا چیز اس کے بارے میں ابھی تک ڈھل مل یقینی کی کیفیت میں تھا۔ چونکہ میں پست قد دیوانوں پر بیٹھنے کا عادی نہ ہو سکا تھا جو دیوار کے سہارے سہارے آراستہ تھے، میں کھڑے کھڑے ہی ہمارے تجربات سے متعلق گفتگو کرتا، بعض اوقات کمرے میں ادھر سے ادھر تیج کے عالم میں ٹہلنے لگتا۔ میرا خیال ہے خوجہ کو اس میں لطف آتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے دل بھر کر مجھے دیکھ سکتا تھا، ہر چند کہ لیمپ کی مدھم روشنی ہی میں۔

اس کی نگاہوں کو اپنا تعاقب کرتا دیکھ کر مجھے اس بات سے اور زیادہ بے چینی محسوس ہوتی کہ اس نے ہماری مشابہت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک دو بار مجھے خیال گزرا کہ وہ اس سے واقف ہے لیکن ناواقفیت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ لگتا تھا جیسے مجھ سے اپنا دل بہلا رہا ہو؛ مجھے کسی چھوٹے موٹے تجربے کا ہدف بنائے ہوئے ہو، وہ معلومات حاصل کر رہا ہو جس سے میں واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان اولین دنوں میں وہ مسلسل میری جانچ پڑتال کرتا گویا کچھ سیکھ رہا ہو اور جس قدر زیادہ سیکھتا اسی قدر اس کے تجسس میں اضافہ ہوتا۔ لیکن وہ کچھ اور آگے قدم بڑھا کر اس عجیب و غریب علم کی تہ میں اتر جانے سے ہچکچاتا ہوا نظر آتا۔ اس کی یہی غیر نتیجہ خیزی تھی جو مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتی، جو اس گھر کو اتنا دم گھونٹتا ہوا بنا دیتی! یہ درست ہے کہ اس کی ہچکچاہٹ سے مجھے کسی قدر جرأت مندی حاصل ہوئی، لیکن اس سے میرا تردد دور نہیں ہوا۔ ایک بار، جب ہم اپنے تجربات پر بات کر رہے تھے، اور ایک دوسری بار، جب اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ابھی تک مسلمان کیوں نہیں ہوا، مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے کسی بحث میں خفیہ طور پر الجھانے کی کوشش کر رہا ہو اور اسی لیے میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے میرے گریز کا احساس کر لیا؛ مجھے لگا کہ اس کی وجہ سے اس کی نظروں میں میری وقعت گھٹ گئی ہے، اور اس سے مجھے غصہ آیا۔ ان دنوں شاید ہمارے پاس ایک دوسرے کو سمجھنے کا یہی طریقہ تھا: ہم میں سے ہر ایک، دوسرے کو کمتر خیال کرتا۔ میں خود کو قابو میں رکھتا، اس خیال سے کہ اگر ہم بغیر کسی سوئے اتفاق کے آتش بازی کا تماشا کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ مجھے گھر لوٹنے

کی اجازت دے دیں گے۔

ایک رات، ایک راکٹ کے غیر معمولی بلندی تک پہنچنے پر شاداں، خوجہ نے کہا کہ وہ ایک دن ایسا راکٹ بنا سکے گا جو چاند تک بلند ہوسکے؛ سارا مسئلہ بارود کی صحیح مقدار کی دریافت کا تھا اور ایسے خانے کی ایجاد کا جو اس مرکب کو برداشت کرنے کا متحمل ہوسکے۔ میں نے توجہ دلائی کہ چاند بہت دوری پر واقع ہے، لیکن اس نے میری بات کاٹ کر کہا کہ یہ بات اسے بھی اتنی ہی معلوم ہے جتنی مجھے، لیکن یہ زمین سے قریب ترین سیارہ نہیں تھا؟ جب میں نے اس کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا تو میری توقع کے خلاف اس سے اس کی تالیفِ قلبی نہ ہوئی بلکہ کچھ اور مضطرب ہوگیا، تاہم مزید کچھ نہیں بولا۔

دو دن بعد، آدھی رات کے وقت، اس نے دوبارہ سوال اٹھایا: مجھے چاند کے قریب ترین سیارہ ہونے پر آخر کیوں اتنا یقین ہے؟ ہوسکتا ہے ہم اپنے فریبِ نظر کا شکار ہوں۔ تبھی میں نے اس سے پہلی بار اپنے فلکیات کے مطالعے کا ذکر کیا اور بطلیموس (ٹولے می) کی عالمِ سماوی کی ہیئت (کاسموگرافی) کے بنیادی اصولوں کی بھی مختصراً تشریح کردی۔ میں نے دیکھا کہ وہ توجہ سے سن رہا ہے، لیکن کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہے جو اس کے تجسس کی غمازی کرے۔ کچھ دیر بعد، جب میں خاموش ہوگیا، اس نے کہا کہ وہ خود بھی بطلیموس کا علم رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا یہ شک کہ چاند کے مقابلے میں کوئی اور سیارہ زمین سے نزدیک تر ہوسکتا ہے رفع نہیں ہوجاتا۔ صبح ہونے تک وہ اس سیارے کے بارے میں یوں گفتگو کر رہا تھا گویا اس نے اس کے وجود کا ثبوت فراہم کرلیا ہو۔

اگلے روز اس نے ایک بڑا ناقص ترجمہ کیا ہوا مخطوطہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ترکی زبان میں اپنی واجبی استعداد کے باوصف میں اسے پڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا خیال ہے یہ ''المجسطی'' (Almageist) کا بالواسطہ (سیکنڈ ہینڈ) خلاصہ تھا، جو اصل نہیں بلکہ کسی اور خلاصے کو سامنے رکھ کر کیا تیار گیا تھا؛ میری دلچسپی صرف سیاروں کے عربی ناموں میں تھی، اور میں اس وقت اس سے جوش میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جب خوجہ نے دیکھا کہ میں متاثر نہیں ہوا

ہوں اور کتاب ایک طرف ڈالدی ہے، تو وہ برہم ہوگیا۔ اس نے یہ کتاب سات طلائی سکوں کے عوض مول لی تھی، اور مناسب یہ تھا کہ میں اپنی خودسری سے پہلو تہی کروں اور صفحے الٹ کر اس کا جائزہ لوں۔ کسی اطاعت گزار طالبِ علم کی طرح، میں نے کتاب دوبارہ کھولی اور ورق گردانی کرتے ہوئے ایک قدیم ہندسی رسمے (ڈایاگرام) سے دوچار ہوا۔ بڑی بھدی نقشہ کشی میں سیاروں کو کرّوں کی صورت میں دکھایا گیا تھا اور انھیں زمین کی نسبت سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اگرچہ کرّوں کا محلِ وقوع درست تھا، نقشہ ساز کو ان کے اور زمین کے درمیانی فاصلے کا کوئی علم نہیں تھا۔ پھر میری نظر ایک چھوٹے سے سیارے پر جاپڑی جو چاند اور زمین کے درمیان تھا؛ قدرے غائر نظر سے دیکھنے پر مجھے روشنائی کی نسبتاً تازگی سے اندازہ ہوگیا کہ مخطوطے میں اس کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔ میں نے کتاب پوری دیکھ کر خوجہ کو لوٹا دی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سیارے کو کھوج کر رہے گا: وہ مذاق کرتا ہوا بالکل معلوم نہیں ہورہا تھا۔ میں نے کچھ نہ کہا، اور ایسا سکوت چھا گیا جس نے نہ صرف اس کے بلکہ میرے ہاتھ پاؤں بھی پھلا دیے۔ چونکہ ہم کسی راکٹ کو اتنی بلندی پر نہ بھیج سکے جو فلکیات پر دوبارہ گفتگو کرنے کے لیے کافی ہوتا، یہ موضوع دوبارہ نہیں چھیڑا گیا۔ ہماری معمولی سی کامیابی محض ایک اتفاق رہی جس کا اسرار کبھی ہمارے ہاتھ نہ آسکا۔

لیکن روشنی اور لو کی شدت اور تابانی کی بابت ہمیں اچھے نتائج حاصل ہوئے، اور ہمیں اپنی کامیابی کا راز معلوم ہوا: جڑی بوٹیاں فروخت کرنے والوں کی ایک ایک دکان چھان مارنے کہ بعد خوجہ کو ایک دکان میں ایک ایسا سفوف ہاتھ لگا جس کے نام کا خود دکاندار کو بھی علم نہیں تھا؛ ہم نے فیصلہ کرڈالا کہ یہ زردی مائل سفوف، جو بڑی شاندار درخشندگی پیدا کرنے کا اہل ہے، دراصل گندھک اور تانبے کے سلفیٹ کا مرکب ہے۔ بعد میں ہم نے اس اثر کو چمک دمک دینے کے لیے ہر اس مادے کو جس کا خیال آیا اس کے ساتھ مرکب کیا، لیکن ہم قہوہ رنگ کتھئی اور سبزی مائل پیلے رنگ سے زیادہ، جن میں بمشکل ہی تمیز کی جاسکتی تھی، کچھ اور نہیں حاصل کرسکے۔ لیکن اتنا بھی، بقول خوجہ، ہر اس چیز کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھا جو استنبول نے کبھی

مشاہدہ کی تھی۔

اور جشن کی دوسری رات ایسا ہی ہمارا پیش کیا ہوا تماشا ثابت ہوا، جیسا کہ ہر متنفس نے کہا، حتیٰ کہ ہمارے حریفوں نے بھی، جنھوں نے ہماری پیٹھ پیچھے خفیہ سازشیں کیں۔ جب ہم سے کہا گیا کہ سلطان گولڈن ہورن کے دوسرے کنارے سے تماشا دیکھنے آیا ہے تو میری حالت خاصی غیر ہوگئی، یہ سوچ کر کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اور مجھے اپنے وطن لوٹنے میں برسہا برس لگ جائیں مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ جب ہمیں نمائش شروع کرنے کا حکم ہوا، تو میں نے دعا مانگی۔ پہلے پہل، مہمانوں کو خوش آمدید کہنے اور تماشے کی ابتدا کرنے کے لیے، ہم نے آسمان میں بے رنگے راکٹ چھوڑے؛ فوراً بعد ہی خالی گھیرے کا تماشا دکھایا جسے خوجہ اور میں نے ''چکی'' کا نام دیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر آسمان سرخ، پیلا، اور سبز ہوگیا، اور اوسان خطا کردینے والے دھماکوں سے گونج اٹھا۔ یہ منظر ہمارے گمان سے بھی زیادہ دیدہ زیب نکلا، جوں جوں راکٹ خالی گھیرے کو اٹھائے اٹھائے تیز رفتاری سے بلند ہوے، خوب خوب چکر پہ چکر کھائے اور، اچانک، سارے گرد ونواح کے رقبے کو گلنار کرتے ہوے ہوا میں بے حرکت معلق ہوگئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال گزرا کہ میں پھر سے وینس میں ہوں، ایک ہشت سالہ بچہ جو پہلی بار آتش بازی کا تماشا دیکھ رہا ہے اور مجھ جتنا ہی ناخوش کہ کپڑوں کا سرخ جوڑا وہ نہیں بلکہ اس کا بڑا بھائی پہنے ہوے ہے جس نے گزشتہ دن جھگڑے میں اپنے کپڑے پھاڑ دیے تھے۔ دھمکتے ہوے راکٹ اتنے ہی سرخ رنگ تھے جتنے چمکیلے بٹنوں والا کپڑوں کا سرخ جوڑا جو میں اس شب نہیں پہن سکا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اب کبھی نہیں پہنوں گا، ایسا ہی سرخ جیسے جوڑے پر مماثل بٹن جو میرے بھائی پر بہت تنگ آتا تھا۔

پھر وہ تماشا دکھایا جسے ہم نے ''فوّارہ'' نام دیا تھا۔ پانچ آدمیوں جتنی بلند مچان کے منھ سے شعلے برسنے لگے؛ دوسرے کنارے کے تماش بینوں کو نیچے کے رخ لپکتے شعلوں کا منظر بہتر طور پر نظر آیا ہوگا؛ ''فوّارہ'' کے منھ سے چھٹتے ہوے راکٹوں سے وہ بھی اتنے ہی جوش میں آگئے ہوں گے جتنے ہم، اور ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا جوش وخروش سرد پڑ جائے: گولڈن

ہورن کی سطح پر ڈونگیاں حرکت میں آگئیں۔ پہلے تو کاغذ کی لگدی سے ڈھلے ہوے برجوں اور فوجی قلعوں نے، ان کے پاس سے گزرتے وقت اپنی برجیوں سے راکٹ داغے، آگ پکڑی اور شعلوں میں بھک سے اڑ گئے — یہ سب گزشتہ سالوں کی فتوحات کی علامت کے طور پر تھا۔ جب انھوں نے وہ کشتیاں چھوڑیں جو اُس سال کی کشتیوں کی نمائندگی کررہی تھیں جب میں اسیر ہوا تھا، دوسری کشتیاں ہماری کشتی پر راکٹوں کے دھماکوں کے ساتھ حملہ آور ہوئیں؛ اس طرح میں نے اس دن کو دہرایا جب غلام بنا تھا۔ جب کشتیاں جلنے اور ڈوبنے لگیں، دونوں کناروں سے ''خدا، او خدا'' کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ پھر، یکے بعد دیگرے، ہم نے اپنے اژدہے چھوڑے؛ ان کے بڑے بڑے نتھنوں، پھٹاس کھلے دہنوں اور نوکیلے کانوں سے شعلے برسنے لگے۔ ہم نے انھیں ایک دوسرے سے لڑایا؛ منصوبے کے مطابق پہلے پہل کوئی بھی دوسرے کو ہرا نہیں سکتا تھا۔ ساحل سے چھوڑے ہوے راکٹوں سے ہم نے آسمان کو اور زیادہ سرخ کردیا، اور جب وہ قدرے سیاہ پڑ چکا، ہمارے آدمیوں نے جو ڈونگیوں میں سوار تھے گھرنیاں گھمائیں، اور اژدہے آہستہ آہستہ آسمان میں بلند ہونا شروع ہوے؛ اب ہر شخص ہیبت کے مارے چیخنے چلانے لگا؛ جوں جوں اژدہے بڑے غل غپاڑے کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوے، ڈونگیوں پر رکھے ہوے تمام راکٹ ایک ساتھ داغ دیے گئے؛ فتیلے جو ہم نے اس مخلوق کے دہانوں میں رکھ دیے تھے شاید عین وقت پر آتش گیر ہوگئے، کیونکہ پورا منظر، ٹھیک ہمارے منصوبے کے مطابق، ایک بھڑکتے ہوے جہنم میں تبدیل ہوگیا۔ جب میں نے قریب ہی کسی بچے کے رونے چیخنے کی آواز سنی، مجھے اندازہ ہوگیا کہ ہم کامیاب رہے ہیں؛ بچے کا باپ اسے بھول بھال کر منھ کھولے اس ہیبت ناک آسمان کو تک رہا تھا۔ آخرکار مجھے اب گھر لوٹنے کی اجازت مل جائے گی، میں نے سوچا۔ ٹھیک اسی وقت، وہ مخلوق جسے میں نے ''ابلیس'' کا نام دیا تھا، ایک چھوٹی سی غیرمرئی سیاہ ڈونگی پر سوار بڑی سبک رفتاری سے اس جہنم میں داخل ہوا؛ ہم نے اتنے بہت سے راکٹ اس پر باندھے تھے کہ ڈر لگا کہیں ساری ڈونگیاں، ہمارے کارندوں سمیت، دھماکے سے نہ اڑ جائیں، لیکن ہر چیز منصوبے کے مطابق رہی؛ ایک دوسرے سے پرسر

پیکار اژدہے چنگاریاں برساتے ہوئے آسمان میں تحلیل ہوگئے، ''ابلیس'' اور اس کے راکٹس، جو ایک ساتھ آتش گیر ہوئے، ایک ہی ہلے میں عالمِ بالا کی طرف روانہ ہوگئے، اس حال میں کہ ''ابلیس'' کے جسم کے ہر حصے سے منتشر ہوتے ہوئے گولے ایک قیامت خیز گونج کے ساتھ ہوا میں پھٹنے لگے۔ اس خیال سے کہ محض ایک ہی لمحے میں ہم نے پورے استنبول کے اوسان مارے دہشت کے خطا کردیے ہیں میں نہال نہال ہوگیا۔ لیکن میں خوفزدہ بھی تھا، صرف اس لیے کہ میں نے، یوں لگ رہا تھا، آخرکار میں نے وہ سب کرنے کی جرأت پالی تھی جو زندگی میں کرنا چاہتا تھا۔ میں کس شہر میں ہوں، اس کی لمحۂ موجودہ میں کوئی اہمیت نہیں رہی تھی؛ میں چاہتا تھا کو وہ ابلیس وہاں یوں ہی معلق رہے، ازدہامِ خلق پر تمام رات چنگاریاں برساتا رہے۔ دائیں بائیں تھوڑا سا جھوم جھام کر، دونوں کناروں سے اٹھتے ہوئے وجد آمیز شوروغوغا کے درمیان وہ پھڑ پھڑاتا ہوا گولڈن ہورن پر گر پڑا لیکن کسی کو گزند نہیں پہنچائی۔ پانی میں غرق ہونے تک اس کے بالائی حصے سے آتش فشانی ہورہی تھی۔

اگلی صبح پاشا نے سونے سے بھری ہوئی تھیلی خوجہ کو بھجوائی، عین مین پریوں کی کہانیوں کی طرح۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ مظاہرے سے بہت خوش ہوا ہے لیکن ''ابلیس'' کی ظفرمندی پر اسے ضرور تعجب ہے۔ ہم مزید دس راتوں تک آتش بازی کا کرتب دکھاتے رہے۔ دن کے وقت جلے ہوئے ڈھانچوں کی مرمت کرتے، نت نئے کرتبوں کے منصوبے بناتے اور راکٹوں کو آتش گیر مادے سے بھرنے کے لیے قیدیوں کو محبس سے بلواتے۔ ایک غلام بینائی سے جاتا رہا، جب بارود کی دس تھیلیاں ٹھیک اس کے چہرے کے پاس پھٹ پڑیں۔

شادی کا جشن ختم ہونے کے بعد میں نے خوجہ کو اور نہیں دیکھا۔ میں اس متجسس آدمی کی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے جو مجھے ہر وقت گھورتا رہتا دور رہنے میں زیادہ عافیت محسوس کرتا، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میرا ذہن گاہے گاہے ان فرحت بخش دنوں کی طرف نہیں بھٹکتا تھا جو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارے تھے۔ میں جب واپس گھر جاؤں گا تو سب کو اس شخص کے بارے میں بتاؤں گا جس کی شکل مجھ سے اس قدر ملتی جلتی ہے لیکن خود جس نے ذہن میں

بار بار آنے والی اس مشابہت کی طرف کبھی ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ میں اپنی کوٹھڑی میں بیٹھتا اور وقت گزاری کے لیے مریضوں کی تشخیص کرتا؛ جب مجھے بتایا گیا کہ پاشا نے بلا بھیجا ہے تو بڑا اہتزاز محسوس کیا، تقریباً خوشی، اور جانے کے لیے دوڑ پڑا۔ پہلے تو اس نے سرسری طور پر میری تعریف کی، ہر متنفس آتش بازی سے مطمئن تھا، مہمانوں کو مسرت ہوئی تھی، میں کافی طباع ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ ناگہانی وہ بولا کہ اگر اسلام لے آؤں تو وہ مجھے فوراً آزاد کردے گا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ بالکل مبہوت۔ میں نے کہا کہ گھر لوٹنا چاہتا ہوں، اپنی حماقت میں میں اپنی ماں اور اپنی منگیتر کے بارے میں دو چار جملے تک بول بیٹھا۔ پاشا نے اپنا کلام دہرایا، یوں جیسے اس نے میری بات سرے سے سنی ہی نہ ہو۔ میں کچھ دیر خاموش رہا۔ جانے کیوں میں ان کاہل اور نکمے لڑکوں کے بارے میں سوچنے لگا جن سے اپنے بچپن میں واقف تھا؛ اس قسم کے بدمعاش لونڈے جو اپنے باپوں کے خلاف ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ میں اپنا مذہب نہیں ترک کروں گا تو پاشا طیش میں آ گیا۔ میں اپنی کال کوٹھڑی میں لوٹ آیا۔

تین دن بعد پاشا نے مجھے پھر بلوایا۔ اس بار وہ اچھے موڈ میں تھا۔ میں فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تھا، یہی کہ تبدیلیِ مذہب سے مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد ملے گی بھی یا نہیں۔ پاشا نے مجھ سے میرا عندیہ معلوم کیا اور کہا کہ وہ یہاں ایک خوبصورت لڑکی سے میری شادی کا خود انتظام بھی کردے گا۔ جرأت کے ایک ناگہانی لمحے میں میں نے کہہ دیا کہ مذہب تو نہیں بدلوں گا، اور پاشا نے، جو ششدر رہ گیا تھا، مجھے بے وقوف کہا۔ ظاہر ہے، وہاں تھا ہی کون جس سے یہ اقرار کرتے ہوئے کہ مسلمان ہوگیا ہوں مجھے شرم آئے گی۔ بعد میں وہ کچھ دیر تک شعائرِ اسلام کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی، مجھے دوبارہ کال کوٹھڑی بھجوادیا۔

جب میں وہاں تیسری بار گیا تو پاشا کے حضور میں مجھے پیش نہیں کیا گیا، بلکہ ایک داروغہ نے مجھ سے میرے فیصلے کے بارے میں دریافت کیا۔ شاید میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہوتا، لیکن اس لیے نہیں بدلا کہ ایک داروغہ نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا! میں نے کہہ دیا کہ ہنوز اپنا مذہب ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ داروغہ نے میرا بازو پکڑا اور زیریں منزل

میں لیے چلا، جہاں مجھے کسی دوسرے کے حوالے کردیا۔ یہ ایک بلند قامت آدمی تھا، ان لوگوں کی طرح دبلا پتلا جو میرے خوابوں میں نظر آتے تھے۔ اس نے بھی مجھے میرے بازو سے پکڑا، اور جب وہ مجھے باغ کے ایک کونے کی طرف لے جارہا تھا، اس الطاف و مہربانی کے ساتھ جیسے کسی صاحبِ فراش اپاہج کی مدد کررہا ہو، ایک اور شخص ہمارے پاس وارد ہوا، اور یہ اتنا حقیقی تھا کہ خواب میں اس کا گزر ممکن نہیں تھا، ایک گرانڈیل آدمی۔ دونوں آدمی، جن میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی سی کلھاڑی تھی، ایک دیوار کے پاس آکر رک گئے اور میرے ہاتھ باندھ دیے: انھوں نے کہا کہ پاشا کا حکم ہے کہ اگر میں اسلام نہیں لے آتا تو میرا سر فوراً قلم کردیا جائے۔ میں سکتے میں آگیا۔

اتنی جلدی کیا ہے، میں نے سوچا۔ وہ میری طرف رحیم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ کم سے کم انھیں دوبارہ اپنے سے پوچھنے نہ دینا، میں خود سے کہہ رہا تھا، لیکن ایک لمحے کے بعد وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔ پلک جھپکتے میں میرا مذہب ایک ایسی شے بن گیا جس کی خاطر مرنا آسان ہوگیا؛ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا، اور، دوسری طرف، میں نے خود کو اتنا ہی قابلِ رحم سمجھا جتنا وہ دونوں سمجھ رہے تھے، وہ دونوں جنھوں نے اپنے پیہم استفسار سے میرے لیے اپنا مذہب ترک کرنا مشکل تر کردیا تھا۔ جب میں نے اپنی توجہ کسی دوسری طرف منعطف کرنی چاہی، تو ہمارے گھر کے پچھواڑے سے باغ کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے نظر آنے والا منظر میری آنکھوں کے سامنے جی اٹھا: میز پر رکھی قزح رنگ سیپیاں جڑی کشتی میں پڑے آڑو اور چیریاں، میز کے عقب میں ایک دیوان جس کی اَپ ہولسٹری پھونس کی مونج سے بُنی ہوئی تھی اور جس پر بکھرے ہوئے بال و پر سے بھرے تکیوں کا رنگ کھڑکی کے چوکھٹے جیسا سبز تھا۔ اور پیچھے، زیتون اور چیری کے درمیان کنویں کی جگت پر مجھے ایک گوریا براجمان نظر آرہی تھی۔ اخروٹ کی ایک بلند شاخ سے لمبی سی رسّی سے بندھا جھولا بمشکل محسوس ہونے والی ہوا میں ہولے ہولے ڈول رہا تھا۔ جب انھوں نے دوبارہ مجھ سے پوچھا، میں نے کہہ دیا کہ مذہب نہیں تبدیل کروں گا۔ انھوں نے ایک ٹھنٹھ کی طرف اشارہ کیا، مجھے گھٹنوں کے بل بٹھایا

اور اس پر میرا سر رکھ دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، لیکن پھر دوبارہ کھول دیں۔ ان میں سے ایک نے کلھاڑی ہوا میں بلند کی۔ دوسرے نے کہا کہ شاید میں اپنے فیصلے پر نادم ہوگیا ہوں: انھوں نے مجھے کھڑا کردیا۔ مجھے اس پر کچھ دیر غور کرلینا چاہیے۔

مجھے مزید غور و خوض کرنے کے لیے چھوڑ کر وہ ٹھنٹھ کے برابر کی زمین کھودنے لگے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید وہ مجھے یہاں ابھی ابھی دفن کردیں گے، اور موت کے خوف کے ساتھ ساتھ اب مجھے زندہ دفن کیے جانے کے ڈر نے بھی آلیا۔ میں اپنے سے ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ جب تک وہ قبر کھود لیں گے میں فیصلہ کرچکا ہوں گا کہ وہ میری طرف بڑھے، صرف ایک اتھلا سا گڑھا کھودنے کے بعد۔ اسی لمحے میں نے سوچا کہ یہاں مرنا کس قدر احمقانہ بات ہوگی۔ محسوس کیا کہ میں مسلمان ہوسکتا ہوں، لیکن عزمِ صمیم کا وقت نہیں تھا۔ اگر میں واپس محبس جاسکتا، اپنی پیاری کوٹھڑی میں جس کا میں بالآخر عادی ہوگیا تھا، تو پوری رات بیٹھ کر مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کرسکتا تھا، لیکن اس طرح نہیں، پلک جھپکتے میں نہیں۔

ناگہانی انھوں نے مجھے دبوچ لیا، اور دھکا دے کر گھٹنوں کے بل بٹھانے لگے۔ ٹھنٹھ پر سر رکھنے سے ذرا پہلے میں کسی کو درختوں کے درمیان حرکت کرتا دیکھ کر، جیسے پرواز کررہا ہو، سٹ پٹا گیا۔ یہ میں تھا، لیکن لمبی سی داڑھی میں، ہوا میں بے آواز چلتا ہوا۔ میں نے چاہا کہ درختوں میں اپنے بھوت کو آواز دوں، لیکن ٹھنٹھ پر سر دبے ہونے کے باعث بول نہ سکا۔ یہ نیند سے مختلف نہیں ہوگا، میں نے سوچا، اور میں نے خود کو قسمت کے حوالے کردیا، منتظر: مجھے اپنی پیٹھ اور گردن کے عقب میں ٹھٹھر سی محسوس ہوئی، میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا، لیکن گردن کے پاس ٹھنڈک کے احساس نے مجھے مجبور کردیا۔ انھوں نے مجھے کھڑا کیا، اور غرّا کر بولے کہ پاشا برافروختہ ہوگا۔ میرے ہاتھ آزاد کرتے وقت انھوں نے ملامت کی: میں خدا اور محمد کا دشمن ہوں۔ وہ مجھے حویلی میں لائے۔

مجھے اپنی عبا کے حاشیے پر بوسہ دے لینے کے بعد پاشا نے میرے ساتھ نرمی کا سلوک کیا؛ بولا کہ اسے یہ بات اچھی لگی ہے کہ میں نے جان کی خاطر اپنا مذہب ترک نہیں کیا، لیکن

ایک لمحے بعد ہی وہ بنکارنے لگا، کہا کہ میں بلا وجہ ہٹ دھرمی کر رہا ہوں، اسلام ایک برتر مذہب ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے جس قدر میری فہمائش کی، اسی قدر اور غصے میں آ گیا؛ اس نے مجھے سزا دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے وضاحتاً کہا کہ وہ کسی کو زبان دے چکا ہے، میں سمجھ گیا کہ اس کے واعدے نے مجھے ان تکلیفوں کو جھیلنے سے بچا لیا ہے جو مجھے بصورتِ دیگر جھیلنی پڑتیں، اور بالآخر مجھے احساس ہوگیا کہ جس شخص کو اس نے قول دیا ہے، اس کے بتانے سے یہ شخص کھب ڈب ہی معلوم ہوتا تھا، خوجہ ہے۔ پھر پاشا نے یکلخت کہا کہ اس نے مجھے خوجہ کو تحفتاً دے دیا ہے۔ میں نے اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا؛ پاشا نے وضاحت کی کہ آج سے میں خوجہ کا غلام ہوں، اس نے خوجہ کو ایک دستاویزی شہادت نامہ دیا ہے، مجھے آزاد کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اب اسی کو ہے، آج کے بعد سے وہ جو چاہے گا میرے ساتھ کرے گا۔ پاشا کمرے سے چلا گیا۔

مجھے بتایا گیا کہ خوجہ بھی حویلی میں موجود تھا، زیریں منزل میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ خوجہ ہی ہے جسے میں نے باغ میں درختوں کے پار دیکھا تھا۔ ہم پیدل چلتے ہوئے اس کے گھر آئے۔ اس نے کہا کہ اسے تمام وقت یہ معلوم رہا تھا کہ میں اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے تو یہاں تک کیا تھا کہ اپنے گھر میں میرے واسطے ایک کمرہ تیار کردیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا مجھے بھوک لگی ہے۔ موت کا خوف ہنوز مجھے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا، اور میں اس حالت میں نہیں تھا کہ کچھ کھا پی سکوں۔ تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح روٹی اور دہی کے چند نوالے، جو اس نے میرے سامنے لا کر رکھ دیے تھے، زہر مار کر ہی لیے۔ خوجہ خوشی خوشی مجھے لقمے چباتے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے طمانیت سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی دیہاتی ابھی ابھی بازار سے بڑا نفیس گھوڑا خرید لایا ہو اور اسے چارہ کھلاتے ہوئے دیکھتا ہو، اس خیال میں مگن کہ مستقبل میں وہ اس سے کیا کیا کام نہ لے گا۔ ان دنوں تک جب اس نے مجھے فراموش کردیا، کیونکہ وہ علم ہیئتِ سماوی کے نظریے کی تفاصیل اور اس گھڑی کے خاکوں میں غرق تھا جسے وہ پاشا کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، مجھے اس نگاہ کو یاد کرنے کے بارہا

موقعے ملے۔

بعد میں اس نے کہا کہ اسے سب کچھ سکھاؤں؛ اسی لیے اس نے پاشا سے مجھے مانگا ہے، اور صرف اس کے بعد ہی وہ مجھے آزادی بخشے گا۔ یہ ''سب کچھ'' کیا تھا اس سے واقف ہونے میں مجھے مہینوں لگ گئے۔ ''سب کچھ'' کا مطلب تھا ہر چیز جو میں نے ابتدائی اور ثانوی اسکول میں سیکھی تھی؛ ساری فلکیات، طب، انجینئری، ہر وہ علم جس کی تعلیم میرے ملک میں دی جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ سب کچھ جو میری کال کوٹھڑی میں پڑی ہوئی کتابوں میں لکھا تھا، جنھیں اگلے ہی دن اس نے ملازم کو بھیج کر اپنے یہاں منتقل کرالیا؛ سب کچھ جو میں نے سنا یا دیکھا تھا، سب کچھ جو میں دریاؤں، پلوں، جھیلوں، غاروں اور بادلوں اور سمندروں کے بارے میں کہہ سکتا تھا، زلزلوں اور رعد کے اسباب ... آدھی رات کو اس نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ستارے اور سیارے تھے جن سے اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی، اس نے کہا کہ ہمیں کم از کم چاند اور زمین کے درمیان والے اس سیارے کے وجود یا عدم وجود کا حتمی ثبوت ضرور فراہم کرلینا چاہیے۔ اس آدمی کی تاراج آنکھوں سے جس نے دن موت کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے میں گزارا ہو، میں ایک بار پھر ہماری ہوش ربا مشابہت پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکا جب خوجہ نے بتدریج ''سیکھنے'' کے لفظ کا استعمال ترک کردیا: ہم مل کر کھوج لگانے والے تھے، مل کر دریافت کرنے والے تھے، ساتھ ساتھ ترقی کرنے والے تھے۔

چنانچہ، دو فرض شناس طالبِ علموں کی طرح جو ایمانداری کے ساتھ اپنا سبق تیار کرتے ہوں حتیٰ کہ اس وقت بھی جب بالغین دروازے کی درازوں سے کان لگائے سننے کے لیے گھر میں موجود نہ ہوں، دو اطاعت گزار بھائیوں کی طرح، ہم کام کرنے بیٹھ گئے۔ شروع شروع میں تو مجھے یوں زیادہ لگا جیسے میں نہایت خواہشمند بڑا بھائی ہوں جو اپنے پرانے سبقوں پر نظر ڈالنے کے لیے اس لیے راضی ہوگیا ہے کہ اپنے کاہل برادرِ خورد کو اپنے برابر پہنچنے میں مدد دے سکے؛ اور خوجہ کا انداز کسی ہوشیار لڑکے سا تھا جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ باتیں جو اس کا برادرِ کلاں جانتا ہے واقعتاً اتنی وافر نہیں ہیں۔ بقول اس کے، اس کے اور میرے علم کے درمیان

فرق ان کتابوں کی تعداد سے زیادہ نہیں تھا جو وہ میری کوٹھڑی سے اٹھوالایا تھا اور ایک شیلف پر ان کی قطار لگا دی تھی اور وہ کتابیں جن کے مشمولات مجھے یاد تھے۔ اپنی غیر معمولی تندہی اور حاضر دماغی کے سبب چھ ماہ کے اندر اندر اس نے اطالوی زبان کی بنیادی فہمید حاصل کر لی تھی جس کو وہ آئندہ نکھارنے والا تھا، میری ساری کتابیں چاٹ گیا تھا، اور اس وقت جب اس نے مجھ سے ہر اس چیز کو دہرانے کے لیے کہا جو مجھے یاد تھی، میری اس پر برتری کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود، اس کا طرزِ عمل کچھ یوں تھا جیسے اسے ایک ایسے علم تک بھی رسائی حاصل تھی جو کتابوں کے ماورا تھا— خود اس کا اتفاق تھا کہ ان میں سے بیشتر بالکل بے وقعت تھیں— ایک علم جو ان تمام چیزوں سے جنھیں جانا جاسکتا ہے زیادہ فطری اور زیادہ گہرا تھا۔ چھ مہینوں کے اختتام پر ہم اب وہ رفیق نہیں رہے تھے جو ساتھ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں، ساتھ ساتھ ترقی کر رہے ہوں۔ یہ وہ تھا جو نئے خیالات لاتا تھا، اور میرا کام اسے صرف چند تفاصیل کی یاددہانی کران تھا تا کہ آگے بڑھنے میں اس کی مدد کرسکوں یا اس پر نظرِ ثانی کروں جو وہ پہلے ہی سے جانتا ہے۔

زیادہ تر ان ''خیالات'' تک، جن میں سے بیشتر میں بھول گیا ہوں، اس کی رسائی رات کے وقت ہوتی تھی، ہمارے ارتجالاً تیار کیے ہوئے کھانے سے فارغ ہونے کے بڑی دیر بعد اور اس وقت جب پاس پڑوس کے تمام مکانوں میں روشنیاں گل ہوچکی ہوتیں اور ہمارے چاروں طرف ہر شے خاموشی کے لبادے میں لپٹی ہوتی۔ صبح کو وہ مسجد کا ابتدائی اسکول پڑھانے جاتا جو چند محلوں آگے تھی، اور ہفتے میں دو دن وہ کسی دوردراز علاقے میں جاتا جہاں میں نے کبھی قدم نہیں دھرا تھا اور ایک مسجد کے اطاق الساعۃ [وہ کمرہ جہاں نماز کے اوقات کا حساب لگایا جاتا ہو] میں جاتا۔ ہمارا بقیہ وقت یا تو رات کے ''خیالات'' کی تیاری میں گزرتا یا ان کے تعاقب میں۔ اس وقت تک بھی مجھے امید تھی، مجھے اس بات پر یقین تھا کہ جلد ہی گھر واپسی ہوگی، اور چونکہ مجھے احساس تھا کہ اس کے ''خیالات'' کی جزئیات پر بحث وتمحیص، جنھیں میں بس واجبی دلچسپی سے سنتا تھا، محض میری واپسی میں تاخیر کا باعث ہوگی، میں نے کبھی خوجہ سے

برملا اظہارِ اختلاف نہیں کیا۔

تو ہم نے اس طرح، فلکیات میں غرق، اس متصورہ سیارے کے وجود یا عدم وجود کے ثبوت کی تلاش کی جدوجہد میں، پہلا سال گزار دیا۔ تو جب وہ دوربینوں کی وضع پر کام کرتا رہا جن کے واسطے عدسے اس نے بھاری قیمت دے کر فلانڈرز سے برآمد کیے تھے، آلے ایجاد کرتا رہا اور پہاڑے بناتا رہا، خوجہ سیارے کا سوال بھول گیا؛ وہ ایک اور ہی عمیق مسئلے میں الجھ گیا تھا۔ وہ بطلیموس کے نظام سے اختلاف کرے گا، وہ کہتا، لیکن ہم نے بخشم بحث نہیں کی؛ وہ بولتا اور میں صرف سنتا: اس نے کہا یہ خیال کرنا کہ سیارے شفاف کُرّوں سے معلق ہیں نری حماقت ہے؛ وہاں کوئی اور چیز بھی تھی جو انھیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے تھی، ایک غیر مرئی طاقت، قوتِ کشش شاید؛ پھر اس نے یہ تجویز پیش کی کہ زمین بھی، سورج کی طرح، کسی اور چیز کے گرد گھوم رہی ہو، شاید سارے ستارے کسی اور سماوی مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہوں جس کے وجود کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہ ہو۔ بعد ازاں، اس دعویٰ کے ساتھ کہ اس کے خیالات بطلیموس سے زیادہ بسیط ہوں گے، اس نے بہت سے نئے سیارے ایک زیادہ وسیع کوسموگرافی کے حصول کے لیے اپنے مشاہدے میں شامل کر لیے اور ایک نئے نظام سے متعلق نظریات وضع کیے؛ ہوسکتا تھا کہ چاند زمین کے گرد گھوم رہا ہو، اور زمین سورج کے گرد؛ شاید محور زہرہ ہو؛ لیکن جلد ہی ان نظریات سے اکتا گیا۔ وہ بس یہ کہنے تک پہنچ گیا تھا کہ اب مسئلہ ان نئے نظریات کو تجویز کرنے کا نہیں بلکہ یہاں کے لوگوں کو ستاروں اور ان کی حرکات سے متعارف کرانے کا ہے —اور وہ یہ کام صادق پاشا سے شروع کرے گا— لیکن اسے پتا چلا کہ اس عرصے میں پاشا کو ایرزروم جلاوطن کردیا گیا ہے۔ لگتا ہے وہ ایک سازشِ ناکام میں ملوث تھا۔

ان برسوں میں جب ہم پاشا کے جلاوطنی سے لوٹنے کے منتظر تھے، ہم نے ایک رسالے کی بابت تحقیق کی جو خوجہ باسفورس کی رووَں کے بارے میں قلمبند کرنے والا تھا۔ ہم نے مہینوں جوار بھاٹوں کے مشاہدے میں گزارے، ہماری ہڈیاں تک منجمد کردینے والی ہوا میں آبنائے کے رخ ڈھالو چٹانوں میں سرگرداں رہے، اور ان برتنوں کے ساتھ وادیوں میں

اترے جو آبنائے میں آ کر خالی ہونے والے دریاؤں کے بہاؤ کی رفتار اور درجۂ حرارت کی
پیمائش کرنے کے لیے ہم لیے لیے پھرتے تھے۔

جب ہم گیبزے میں تھے، ایک شہر جو استنبول سے بہت زیادہ دور نہیں تھا اور جہاں ہم
پاشا کی فرمائش پر تین ماہ کے لیے اس کے کسی کام کاج کی دیکھ رکھ کے لیے آئے ہوئے تھے، تو
وہاں کی مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کے تفاوت سے ایک بالکل نیا خیال خوجہ کے ذہن میں آیا: وہ
ایک ایسی گھڑی بنائے گا جو بے عیب صحت سے اوقاتِ نماز کی نشاندہی کرے گی۔ اسی وقت میں
نے اسے بتایا تھا کہ میز کیا ہوتی ہے۔ جب میں فرنیچر کے اس عدد کو لے کر گھر آیا جو میں نے
ایک بڑھئی سے خاص طور پر نقشہ دے کر اپنی فرمائش کے مطابق بنوایا تھا، خوجہ کو اس سے کوئی
مسرت نہ ہوئی۔ اس نے اسے ایک چہار پایہ تابوت سے تشبیہ دی، اور کہا کہ یہ شگونِ بد ہے،
لیکن بعد میں وہ میز اور کرسی دونوں ہی کا عادی ہوگیا؛ اس نے اعلان کیا کہ اس طرح بیٹھ کر وہ
بہتر طور پر سوچ اور لکھ سکتا ہے۔ ہمیں نماز کی گھڑیوں کے واسطے بیضوی گراریوں کو ڈھلوانے کے
لیے استنبول جانا پڑا جو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی قوس سے مطابقت رکھتی ہوں۔ واپسی کے
سفر میں ہماری میز، اس حال میں کے اس کی ٹانگوں کا رخ ستاروں کی طرف تھا، ہمارے پیچھے
پیچھے ٹٹو کی کمر پر لدی آ رہی تھی۔

ان اولین ماہ میں، میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے، خوجہ نے شمالی
ملکوں میں نماز اور روزے کے اوقات کا حساب لگانے کی کوشش کی، وہ شمالی ملک جہاں رات
اور دن کی مدت میں بڑا فرق تھا اور جہاں آدمی کو برسوں تک سورج نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ایک
اور مسئلہ یہ تھا کہ آیا روئے زمین پر کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں لوگ جس طرف بھی رخ کریں
وہ مکے ہی کی طرف ہو۔ جوں جوں اسے یہ احساس زیادہ ہوا کہ میں ان مسائل سے لاتعلق
ہوں، اتنا ہی زیادہ وہ میرے ساتھ نفرت و ملامت کا برتاؤ کرنے لگا، لیکن اس وقت میں نے
یہی سوچا کہ اسے میری ''برتری اور فرق'' کا شعور ہوگیا ہے، اور شاید وہ اس بات پر جھنجھلا رہا
ہے کہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بھی اس بات کا احساس ہے: وہ ذہانت کے بارے میں بھی اتنی ہی

گفتگو کرتا جتنی سائنس کے بارے میں؛ جب پاشا لوٹ آئے گا، اسے اپنے منصوبوں کے
بدلے الطاف و کرم سے نوازے گا، کوسموگرافی سے متعلق اس کے نظریات کے بدلے جنھیں وہ
مزید آگے بڑھائے گا اور ایک موڈل کے ذریعے، ایک نئی گھڑی کے ذریعے، ان کا مظاہرہ
کرے گا؛ وہ ہمیں اس تجسس اور اشتیاق میں مبتلا کردے گا جو خود اس میں مشتعل ہے، وہ ایک
احیائے نو کا بیج بوئے گا: دونوں، وہ اور میں، منتظر تھے۔

(۳)

ان دنوں میں وہ ایسی گھڑی بنانے کی فکر میں تھا جس کی مشین میں بڑی گراری استعمال ہو جس سے ہفتے کے بجائے مہینے میں ایک بار وقت درست کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس قسم کے گراری والے آلے کو صورت دینے کے بعد، اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب ایک ایسی گھڑی بنانی چاہیے جسے سال میں ایک ہی بار چھیڑنے کی ضرورت پڑے؛ آخر کار اس کے حل کے طور پر اس نے اعلان کیا کہ اس گرانڈیل گھڑی کے دندانے دار پہیوں کو چلانے کے لیے حسب ضرورت توانائی مہیا کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ سیٹینگز کے درمیانی وقت کے حساب سے ان کی تعداد اور اوزان میں اضافہ کیا جائے۔ یہ وہ دن تھا جب مسجد کے اطاق الساعۃ میں اس نے اپنے دوستوں سے سنا کہ پاشا ایرزروم سے ایک برتر عہدہ سنبھالنے کے لیے لوٹ آیا ہے۔

اگلی صبح خوجہ مبارکباد دینے اس کے پاس گیا۔ ملاقاتیوں کے ہجوم میں پاشا نے اسے چن لیا، اس کی دریافتوں میں دلچسپی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ میرے بارے میں بھی پوچھا۔ اس رات ہم نے گھڑی کو پرزہ پرزہ الگ کیا اور بار بار دوبارہ منظّم کیا، کائنات کے موڈل میں یہاں وہاں کچھ چیزوں کا اضافہ کیا، اور اپنے موقلموں سے سیاروں کی رنگ آمیزی کی۔ خوجہ نے مجھے

اپنی تقریر کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو اس نے بڑی محنت سے تیار کی تھی اور پھر ازبر کرلی تھی، جس سے اس کی نیت اپنے سامعین کو محض شائستہ زبانی اور شاعرانہ زینت کے زور سے متأثر کرنے کی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے، اپنے اعصاب کو آسودہ کرنے کی خاطر، اس نے ایک بار پھر اس خطیبانہ ٹکڑے کی قرأت کی جو سیاروں کے گردش کرنے کی منطق کے بارے میں تھا، لیکن اس مرتبہ اس نے اسے منقلب طور پر پڑھا، کسی جنتر منتر کی طرح۔ ایک گاڑی پر جو وہ کہیں سے مانگ لایا تھا ہمارے آلات لاد کر وہ پاشا کی حویلی کا عازم ہوا۔ میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ جس گھڑی اور موڈل نے مہینوں تک پورے گھر کو بھرا رکھا تھا اب یک اپسی گاڑی پر اس قدر چھوٹے سے نظر آرہے تھے۔ اس شام وہ بہت دیر سے لوٹا۔

جب اس نے حویلی کے باغ میں آلات گاڑی سے اتارے اور پاشا نے ان بے ربط اشیا کا معائنہ ایک بدمزاج بوڑھے کی سختی مزاجی سے کیا جو اس قسم کی تفریح بازی کے موڈ میں بالکل نہ ہو، تو خوجہ نے جھٹ اپنی رٹی رٹائی تقریر داغ دی۔ پاشا نے، میری طرف اشارہ کرتے ہوے، کہا، جیسا کہ خود سلطان برسوں بعد کہنے والا تھا: ''تو کیا یہ سب اسی نے تم کو سکھایا ہے؟'' بس اولاً اس کا تأثر یہی تھا۔ خوجہ کے جواب نے پاشا کو اور ہکا بکا کردیا۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا، لیکن پھر سمجھ گیا کہ پاشا کا اشارہ میری طرف ہے۔ خوجہ نے اس سے کہا کہ میں بڑا پڑھا لکھا بے وقوف ہوں۔ یہ بیان کرتے وقت اس نے میرا بالکل خیال نہیں کیا، اس کا ذہن تو ابھی تک پاشا کی حویلی میں جو درپیش آیا تھا اسی پر لگا ہوا تھا۔ اس نے اس پر اصرار کیا کہ ہر چیز خود اس کی دریافت ہے، لیکن پاشا نے اس پر یقین نہیں کیا، وہ قصوروار ٹھہرانے کے لیے کسی اور کا متلاشی تھا کیونکہ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ اس کا پیارا خوجہ ہی گناہگار نکلے۔

تو یوں وہ دونوں میرے بارے میں، چہ جائیکہ ستاروں کے بارے میں، گفتگو کرنے لگے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس موضوع پر بحث کرنے سے خوجہ خوش نہیں۔ خاموشی چھا گئی، جبکہ پاشا کی توجہ اپنے اردگرد دوسرے مہمانوں کی طرف مبذول ہوگئی۔ رات کے طعام کے وقت، جب خوجہ نے فلکیات اور اپنی دریافتوں کے اعادے کی ایک اور کوشش کی، پاشا نے کہا کہ وہ

میرا چہرا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اس کے بجائے خوجہ کا چہرا سامنے آ گیا ہے۔ میز پر دوسرے لوگ بھی موجود تھے، اس موضوع پر کہ کس طرح بنی نوعِ آدم کی تخلیق جوڑوں کی شکل میں ہوئی ہے بک بک شروع ہوگئی، اس سے متعلق مبالغہ آمیز مثالیں پیش کی گئیں، توام جن کی مائیں تک انھیں الگ الگ نہ پہچان سکتی ہوں، ہم شبیہ جو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے خوفزدہ ہوں لیکن اس کے باوجود، ایک دوسرے سے کبھی جدا ہونے کے قابل بھی نہ ہوں، گویا کسی جادو کے غلبے میں ہوں، ڈکیت جو معصوموں کے نام اختیار کر کے ان کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ جب کھانا ختم ہوا اور مہمان رخصت ہونے لگے، پاشا نے خوجہ سے توقف کرنے کے لیے کہا۔

جب خوجہ نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا، تو شروع میں پاشا اس سے بالکل محظوظ ہوتا ہوا نہیں لگا، بلکہ اس بات سے ناخوش ہوا کہ انمل بے جوڑ باتوں سے جو بالکل ناقابلِ فہم تھیں اس کا اچھا بھلا موڈ دوبارہ خراب کر دیا گیا ہے، لیکن بعد میں، تیسری بار خوجہ سے اس کی تقریر منھ زبانی سننے کے بعد، اور ہمارے نظامِ شمسی کے ماڈل کے زمین اور ستاروں کو گھومتے، اپنی آنکھوں کے سامنے چکر لگاتے دیکھ کر، اس نے ایک دو باتیں ذہن نشین کر لی تھیں، کم از کم اب وہ کسی قدر توجہ کے ساتھ خوجہ کی بات سن رہا تھا، اور بس تھوڑے سے ہی تجسس کا اظہار کر رہا تھا۔ ٹھیک اس نقطے پر خوجہ نے بڑے شدید اصرار کے ساتھ کہا کہ ستارے ویسے نہیں ہیں جیسے لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ وہ اس طرح گردش کرتے ہیں۔ ''اچھا بھئی،'' پاشا نے آخر کار کہا، ''میں سمجھ گیا، یہ بھی ممکن ہے، کیوں نہیں، بہر حال۔'' جواب میں خوجہ نے کچھ نہیں کہا۔

میں نے تصور کیا کہ لمبی خاموشی چھا گئی ہوگی۔ خوجہ دریچے سے گولڈن ہورن پر چھائی ہوئی تاریکی میں دیکھتے ہوئے بولتا رہا۔ ''وہ اس نقطے پر آ کر کیوں ٹھہر گیا، وہ آگے کیوں نہیں بڑھا؟'' اگر یہ سوال تھا تو اس کا جواب مجھے خوجہ کے جواب سے بہتر نہیں معلوم تھا: میرا خیال ہے کہ پاشا نے کیا کہا ہوتا اس کے بارے میں خوجہ کی ایک رائے ہوگی، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ لگتا تھا وہ اس بات پر برہم ہے کہ دوسرے اس کے خوابوں میں اس کے شریک نہیں۔ پاشا

کو بعد میں گھڑی سے دلچسپی پیدا ہوگئی، اس نے خوجہ سے اسے کھولنے اور گراریوں، اس کی میکانکی ساخت، اور اس کے پاسنگوں کا مقصد بتانے کی فرمائش کی۔ پھر، جیسے کسی تاریک اور نفرت انگیز سانپ کے بل کی طرف بڑھ رہا ہو، اس نے ٹک ٹک کرتے ہوئے آلے میں اپنی انگلی ڈالی تھی اور پھر کھینچ لی تھی۔ خوجہ گھنٹہ گھروں کا ذکر کر رہا تھا، اس نماز کی قدرت کی تعریف کر رہا تھا جسے سب لوگ ٹھیک ایک ہی لمحے ادا کریں، کہ اچانک پاشا پھٹ پڑا۔ ''اسے نکال دو!'' وہ بولا۔ ''جی چاہے تو زہر دے دو، اور جی چاہے تو آزاد کر دو۔ اس سے تمھاری زندگی آسودہ ہو جائے گی۔'' میں نے خوجہ کی طرف شاید ایک لمحے کے لیے امید و بیم کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے اس وقت تک آزاد نہیں کرے گا جب تک کہ ''انھیں'' احساس نہیں ہو جاتا۔

''انھیں'' کس بات کا احساس ہونا چاہیے، یہ میں نے نہیں پوچھا۔ اور شاید مجھے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ نہ جان جاؤں کہ یہ بات تو خود خوجہ کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بعد میں انھوں نے دوسری چیزوں کے بارے میں گفتگو کی، پاشا اپنے سامنے پڑے آلات پر ناک بھوں چڑھا رہا تھا اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ خوجہ رات کے پچھلے پہر تک حویلی میں رہا، اس پر امید انتظار میں کہ پاشا کی دلچسپی عود کر آئے گی، گو اسے معلوم تھا کہ اب اور اس کی پزیرائی نہیں ہوگی۔ آخر کار اس نے اپنے آلات گاڑی پر لادے۔ میں نے ایک واپسی کی تاریک اور پرسکوت سڑک کے ایک مکان میں کسی آدمی کا تصور کیا جو اپنے بستر پر لیٹا ہو لیکن سونے سے عاجز: پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے درمیان گرانڈیل گھڑی کے ٹک ٹک کرنے کی آواز پر متحیر۔

خوجہ دن نکلنے تک جاگتا رہا۔ میں ختم ہوتی ہوئی موم بتی کو بدلنا چاہتا تھا، لیکن اس نے مجھے روک دیا۔ چونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ سننے کا خواہشمند ہے، میں نے کہا، ''پاشا کی سمجھ میں آ جائے گا۔'' یہ کہتے وقت ابھی تک اندھیرا تھا، شاید وہ جانتا تھا، جیسا کہ میں بھی جانتا تھا، کہ مجھے اس پر یقین نہیں تھا، لیکن ایک لمحے کے بعد وہ بول اٹھا، یہ کہتے ہوئے کہ شاید سارا مسئلہ اس لمحے کے اسرار کو حل کرنے کا تھا جب پاشا بولتے بولتے رک گیا تھا۔

اس راز کو پالینے کے لیے، وہ پہلا موقع ملتے ہی پاشا سے ملنے گیا۔ اس بار اس نے خوش طبعی سے خوجہ کا استقبال کیا۔ بولا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ کیا ہوا تھا، یا جو مدعا رہا تھا، اور خوجہ کے جذبات کو تسلی پہنچانے کے بعد اسے ایک ہتھیار پر کام کرنے کے لیے کہا۔ ''دنیا کو ہمارے دشمنوں کے واسطے ایک محبس بنانے والا ہتھیار!'' یہ اس نے کہا تھا، لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ہتھیار کیا چیز ہونا چاہیے۔ اگر خوجہ سائنس سے اپنے جنون کو اس طرف مائل کر سکے، تو پاشا اس کی اعانت کرے گا۔ ظاہر ہے اس نے اس وقف کے بارے میں کچھ نہیں کہا جس کی ہم آس لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے تو بس چاندی کے سکوں سے بھری ایک تھیلی ہی خوجہ کو پکڑا دی تھی۔ ہم نے اسے گھر پر کھولا اور سکے گننے لگے: کل سترہ نکلے — ایک عجیب تعداد! تھیلی دینے کے بعد ہی اس نے کہا تھا وہ نوجوان سلطان کو اس بات پر راضی کر لے گا کہ خوجہ کو باریابی کا شرف بخشے۔ اس نے وضاحت کی کہ طفل کو ''اس قسم کی چیزوں'' سے دلچسپی تھی۔ نہ میں نے اور نہ خوجہ نے، جو مقابلتاً زیادہ تیزی سے جوش میں آجاتا تھا، اس کے وعدے کو زیادہ سنجیدگی سے برتا، لیکن ہفتے کے اندر اندر خبر ملی۔ پاشا ہمیں، ہاں، مجھے بھی، سلطان کی خدمت میں پیش کرنے والا ہے، شام کی افطار کے بعد۔

تیاری میں خوجہ نے اپنی تقریر پر جو اس نے پاشا کو سنائی تھی نظرِ ثانی کی اور دوبارہ اسے ازبر کیا، اس میں اس لحاظ سے ردوبدل کیا کہ ایک نو سال کا بچہ اسے سمجھ سکے۔ کسی وجہ سے اس کا ذہن پاشا پر لگا ہوا تھا، سلطان پر نہیں، وہ ابھی تک اسی سوچ میں غرق تھا کہ پاشا کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کا بھید بھی اس پر منکشف ہونے والا تھا۔ یہ ہتھیار جو پاشا بنوانا چاہتا تھا، اسے کیا چیز ہونا چاہیے تھا؟ میرے کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا، خوجہ اب اکیلا کام کر رہا تھا۔ جہاں وہ آدھی آدھی رات تک اپنے کمرہ میں مقفل ہو کر بیٹھتا، میں اپنے دریچے کے پاس خالی الذہن بیٹھا رہتا، یہ تک نہیں سوچتا کہ گھر کب واپسی ہوگی، بس کسی گاودی لڑکے کی طرح دن سپنے دیکھتا: یہ خوجہ نہیں بلکہ میں میز کے برابر بیٹھا کام کر رہا تھا، جسے کہیں بھی، کبھی بھی جہاں چاہوں جانے کی مکمل آزادی تھی!

پھر ایک شام ہم نے اپنے آلات گاڑی پر لادے اور محل کی طرف چل دیے۔ استنبول کی سڑکوں پر چلنے سے مجھے شغف پیدا ہو گیا تھا، اور میں نے اپنے کو وہ غیرمرئی آدمی محسوس کیا جو کسی بھوت کی طرح باغوں میں دیوقامت چناروں، چیسٹ نٹ اور ارغوان کے درختوں کے درمیان حرکت کر رہا ہو۔ ہم نے خدمتگاروں کی مدد سے آلات کو دوسرے صحن میں اس جگہ جمایا جو ہمیں بتائی گئی تھی۔

حاکم ایک پیارا سا سرخ رخسار بچہ تھا جس کی قامت اس کی عمر سے متناسب تھی۔ اس نے آلات کو یوں چھوا جیسے وہ اس کے کھلونے ہوں۔ کیا میں اب اس وقت کا خیال کر رہا تھا جب میں اس کا ہم سر اور دوست ہونا چاہتا تھا، یا، بہت بعد میں، پندرہ سال بعد، اس زمانے کا جب ہم دوبارہ ایک دوسرے سے ملے؟ میں نہیں کہہ سکتا؛ لیکن میں نے فوراً یہ محسوس کیا کہ مجھے اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچانا چاہیے۔ خوجہ پر ہیجانی دباؤ کا دورہ پڑا، دراں حالیکہ سلطان کے مصاحبین انتظار کرتے رہے، تجسس کے مارے ادھر ادھر بھیڑ بھاڑ کرنے لگے۔ آخرکار خوجہ نے ابتدا کی؛ اس نے اپنی کہانی میں نئی چیزوں کا اضافہ کیا؛ اس نے ستاروں کا یوں ذکر کیا جیسے وہ کوئی ذی عقل اور ذی روح وجود ہوں، انھیں پرکشش، پراسرار مخلوق سے تشبیہہ دی جنھیں علمِ حساب اور ہندسہ (جیومیٹری) آتے ہوں، اور جو اپنے علم کے مطابق گردش کرتے ہوں۔ یہ دیکھ کر کہ طفل پر اثر ہو رہا ہے اور وہ گاہے گاہے اپنا سر اٹھا کر تعجب سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے، خوجہ اور زیادہ جوش میں آ گیا۔ دیکھو، گھومتے ہوئے شفاف کروں پر ٹنگے سیارے یہاں ماڈل پر دکھائے گئے ہیں، وہ رہی زہرہ، اور وہ اس طرح گردش کرتی ہے، اور وہ اس طرف معلق بڑا سا گولا، وہ چاند ہے اور یہ، آپ سمجھے، ایک مختلف راستے پر گردش کرتا ہے۔ جب خوجہ نے ستاروں کو گھمایا، ماڈل سے لگی ہوئی گھنٹی بڑی شیریں نغمگی سے بجنے لگی اور ننھا منا سلطان، خوفزدہ ہو کر، ایک قدم پیچھے ہٹا، پھر، ہمت پکڑ کر، سمجھنے کی کوشش کی اور بجتی ہوئی مشین کی طرف بڑھا جیسے وہ کوئی طلسماتی خزانے سے بھرا صندوق ہو۔

اب، جیسے جیسے میں اپنی یادوں کو دہراتا ہوں اور اپنے واسطے ایک ماضی کے ابداع کی

کوشش کرتا ہوں، تو مجھے یہ ایک شادمانی کی تصویر نظر آتا ہے جو ان کہانیوں کے قابل ہو جو میں اپنے بچپن میں سنا کرتا تھا، ہو بہو اسی طرح جیسے ان پریوں کی کہانیوں والی کتابوں کے مصور دکھانا چاہتے تھے۔ بس اتنا ہی چاہیے کہ استنبول کی سرخ، جنجر بریڈ چھتوں کو ان شیشے کے کروں میں محصور کردیا جائے جنھیں اگر جنبش دی جائے تو برف کے گالوں کی طرح چکرانے لگیں۔ بچے نے خوجہ سے سوال کرنے شروع کردیے تھے، اور اس نے ان کے جواب ڈھونڈ نکالنے۔

ستارے فضا میں کیسے رہتے ہیں؟ وہ شفاف کروں سے لٹکے ہوتے ہیں! کرّے کس چیز کے بنے ہوتے ہیں؟ ایک غیر مرئی مادّے کے، اسی لیے وہ خود بھی نظر نہیں آتے! ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں؟ نہ، ہر ایک کا اپنا منطقہ ہوتا ہے، تہہ دار، جیسا کہ ماڈل میں دکھایا گیا ہے! اتنے بہت سے ستارے ہیں، اتنے ہی کرّے کیوں نہیں؟ کیونکہ وہ بہت دور ہیں! کتنی دور؟ بہت، بہت! کیا دوسرے ستاروں کی بھی گھنٹیاں ہیں جو ان کی گردش کے ساتھ بج اٹھتی ہیں؟ نہیں، ہم نے گھنٹیاں ایک گردش کے ختم ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے لگائی ہیں! کیا رعد کا اس سے کوئی تعلق ہے؟ کوئی نہیں! تو پھر کس سے ہے؟ بارش سے! کیا کل بارش ہونے والی ہے؟ آسمان کے مشاہدے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نہیں! سلطان کے بیمار شیر کے بارے میں آسمان کیا ظاہر کرتا ہے؟ کہ وہ اچھا ہوجائے گا، لیکن آدمی کو صبر سے کام لینا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

جب وہ بیمار شیر کے بارے میں اپنی رائے دے رہا تھا، خوجہ مسلسل آسمان کی طرف دیکھتا رہا، جیسے ستاروں کے بارے میں گفتگو کرتے وقت دیکھا تھا۔ گھر لوٹنے پر اس نے اس تفصیل کا ذکر کیا، اور کہا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ اہم نہیں ہے کہ بچہ سائنس اور سوفسطائیت میں تمیز کرے، اہم یہ ہے کہ اسے چند چیزوں کا ''احساس'' ہو۔ وہ پھر وہی لفظ استعمال کررہا تھا، گویا مجھے معلوم ہو کہ اسے کس چیز کا احساس ہونا چاہیے، جبکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے مسلمان ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ محل سے لوٹتے وقت جو تھیلی انھوں نے ہمیں دی اس میں ٹھیک پانچ طلائی سکے تھے۔ خوجہ بولا کہ سلطان کی گرفت میں یہ بات آگئی

ہے کہ ستاروں میں جو کچھ ہورہا ہے اس کے پیچھے ایک منطق کارفرما ہے۔ اوہ میرے سلطان! بعد میں، بہت بعد میں کہیں جاکر میں نے اسے جانا! مجھے اس پر تعجب ہوتا کہ وہی چاند ہمارے دریچے سے اندر آتا تھا، میں بچہ بن جانا چاہتا تھا! خوجہ، اپنے کو روکنے کے ناقابل، اسی موضوع کی طرف لوٹ پڑا: شیر والا سوال اہم نہیں ہے، بچے کو جانوروں سے محبت ہے، بس، بات اتنی ہی ہے۔

اگلے روز وہ اپنے کمرے میں بند ہوکر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا: چند دن بعد اس نے گھڑی اور نجوم کو پھر گاڑی پر لادا اور، کھڑکیوں کے پیچھے کی ان متجسس نگاہوں کے نیچے، اس بار ابتدائی اسکول کی طرف نکل پڑا۔ جب وہ شام کے وقت لوٹا تو کافی پژمردہ نظر آرہا تھا، لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ خاموش رہتا: ''میرا خیال تھا کہ بچے بھی سلطان کی طرح سمجھ لیں گے، لیکن میں غلطی پر تھا'' وہ بولا۔ وہ بس خوفزدہ ہوگئے۔ جب لیکچر دینے کے بعد خوجہ نے سوال کیے، ایک بچے نے جواب دیا کہ جہنم آسمان کے دوسری طرف ہے اور رونے لگا۔

اگلا ہفتہ اس نے حاکم کی ذہانت کے بارے میں اپنے اعتماد کو سہارا دینے میں لگایا؛ اس نے میرے ساتھ ہر وہ لمحہ جو ہم نے دوسرے صحن میں گزارا تھا دہرایا، اپنی توجیہات کے لیے میری مدد چاہی: بچہ ہوشیار تھا، ٹھیک ہے نا؛ یہ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ کس طرح غور وفکر کرنا چاہیے، ٹھیک؛ وہ اتنی اخلاقی قوت کا مالک تھا کہ دربار میں اپنے آس پاس کے لوگوں کے دباؤ کے خلاف ڈٹا رہے، ٹھیک! چنانچہ اس سے بہت پہلے کہ سلطان ہمارے خواب دیکھے، جیسا کہ وہ آنے والے سالوں میں کرنے والا تھا، ہم نے اس کے خواب دیکھنے شروع کردیے۔ ان دنوں خوجہ گھڑی پر بھی کام کررہا تھا؛ لیکن مجھے خیال ہوا کہ وہ ساتھ ساتھ تھوڑا بہت ہتھیار کی بابت بھی سوچ رہا ہے، کیونکہ جب پاشا نے اسے بلا بھیجا تو اس نے یہ اقرار کیا۔ لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ اسے پاشا سے کوئی امید نہیں رہی تھی۔ ''وہ دوسروں جیسا ہوگیا ہے،'' اس نے کہا۔ ''وہ مزید یہ نہیں جاننا چاہتا کہ وہ نہیں جانتا۔'' ہفتہ بھر بعد حاکم نے خوجہ کو بارِ دگر بلا بھیجا، اور وہ گیا۔

سلطان نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ خوجہ کی آؤ بھگت کی۔ ''میرے شیر کی طبیعت

اب بہتر ہے،'' وہ بولا، ''بالکل ویسی ہی جیسی تم نے پیش گوئی کی تھی۔'' بعد میں وہ اس کے مصاحبین کے ساتھ صحن میں گئے۔ جوہڑ میں اپنی مچھلیوں کو دکھاتے ہوے حاکم نے پوچھا کہ ان کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ ''وہ سرخ ہیں،'' خوجہ نے مجھے بات کرتے وقت بتایا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا کہوں۔'' پھر اس کی توجہ مچھلیوں کے حرکت کرنے کے انداز پر گئی؛ لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اس انداز کے بارے میں باہم گفتگو کر رہی ہوں، تاکہ اسے درجۂ کمال کو پہنچا سکیں۔ خوجہ نے کہا کہ اسے مچھلیوں میں ذہانت نظر آتی ہے۔ جب ایک بونا، جو حرم کے ایک خواجہ سرا کے برابر کھڑا تھا جو حاکم کو مسلسل اس کی والدہ کی تنبیہات یاد دلا رہا تھا، اس پر ہنس پڑا، تو سلطان نے اسے کافی ڈانٹا ڈپٹا۔ سزا کے طور پر اس نے سرخ سر بونے کو گاڑی پر چڑھتے وقت اپنے برابر نہیں بیٹھنے دیا۔

وہ گاڑی پر سوار ہو کر تماشا گھر گئے تھے، شیر کے گھر۔ وہ شیر، چیتے اور تیندوے جو سلطان نے خوجہ کو دکھائے ایک قدیم گرجے کے ستون سے اپنی زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوے تھے۔ وہ اس شیر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے جس کے صحت یاب ہو جانے کی پیش گوئی خوجہ نے کی تھی، بچہ اس سے بولا، خوجہ سے اس کا تعارف کراتے ہوے۔ اس کے بعد وہ ایک اور شیر کے پاس گئے جو کونے میں پسرا ہوا تھا، یہ جانور، جو دوسروں کی طرح بدبودار نہیں تھا، حاملہ تھا۔ حاکم نے، اس حال میں کہ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، پوچھا، ''یہ کتنے بچوں کو جنم دے گی، کتنے نر ہوں گے، کتنے مادہ؟''

ششدر، خوجہ نے کچھ کہا جسے بعد میں اس نے مجھے اپنی ''فاش غلطی'' بتایا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ اسے فلکیات کا علم تو ہے لیکن وہ نجومی نہیں۔ ''لیکن تم شاہی نجومی حسین افندی سے زیادہ علم رکھتے ہو!'' بچے نے کہا تھا۔ خوجہ نے جواب نہیں دیا، اس ڈر سے کے قریب میں کوئی سن نہ لے اور حسین افندی سے جا کر لگا دے۔ بے صبرے سلطان نے اصرار کیا: یہ خوجہ تو کچھ بھی نہیں جانتا، کیا اس نے بے سود ہی ستاروں کا مشاہدہ کیا ہے؟

جواب میں خوجہ ان باتوں کے فوراً کہنے پر مجبور ہو گیا جنھیں وہ بہت بعد میں ہی کہنا

چاہتا تھا: اس نے جواب دیا کہ اس نے ستاروں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ سیکھا ہے اس سے بہت کارآمد نتائج برآمد کیے ہیں۔ حاکم کی خاموشی کا اچھا مطلب نکالتے ہوے، جو وہ پھیلتی ہوئی آنکھوں سے سن رہا تھا، اس نے کہا کہ ستاروں کے مشاہدے کے لیے ایک رصدگاہ کی تعمیر ناگزیر ہے؛ ویسی ہی رصدگاہ جو اس کے دادا احمد اول کے دادا مراد سوم نے تقی الدین افندی کے واسطے نوے سال پہلے تعمیر کروائی تھی، اور جو بعد ازاں بے توجہی کے ہاتھوں کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بلکہ، اس سے بھی زیادہ نکلتی ہوئی کوئی شے: ایک سائنس گھر جہاں محقق نہ صرف ستاروں بلکہ پوری دنیا کا، اپنے دریاؤں اور سمندروں، بادلوں اور پہاڑوں، پھولوں اور درختوں اور، دریں چہ شک، اپنے وحوش کے ساتھ مشاہدہ کر سکیں، اور پھر اطمینان سے ان مشاہدات پر بحث و تمحیص کے لیے جمع ہو سکیں اور خرد کے بڑھاوے کے لیے پیش رفت کر سکیں۔

سلطان نے خوجہ کو اس منصوبے کے بارے میں، جس سے میں بھی پہلی بار متعارف ہو رہا تھا، بات کرتے ہوے اس طرح سنا جیسے کوئی خوشگوار حکایت ہو۔ جب وہ اپنی سواریوں میں محل لوٹ رہے تھے، اس نے ایک بار پھر استفسار کیا، ''شیرنی کیسے بچے جنم دے گی، کیا خیال ہے تمھارا؟'' خوجہ نے اس کے بارے میں پہلے ہی خوب غور کر لیا تھا، چنانچہ اس بار یہ جواب دیا، ''نر اور مادہ بچوں کی مساوی تعداد پیدا ہو گی۔'' گھر پر اس نے مجھے بتایا کہ یہ کہنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ''وہ بے وقوف طفل میری مٹھی میں آ جائے گا،'' اس نے کہا۔ ''میں شاہی منجم حسین افندی سے زیادہ طاق ہوں!'' حاکم کے بارے میں اس لفظ کے استعمال پر مجھے دھچکا لگا؛ پتا نہیں کیوں میرے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ میں ان دنوں اکتاہٹ کے مارے گھریلو کاموں سے اپنے کو مشغول رکھے ہوے تھا۔

بعد میں وہ یہ لفظ کچھ اس طرح استعمال کرنے لگا گویا کوئی طلسمی کنجی ہو جو ہر دروازے کو کھولنے پر قدرت رکھتی ہو: کیونکہ وہ ''بے وقوف'' تھے، انھوں نے اپنے سر سے اوپر حرکت کرتے ستاروں کا مشاہدہ کیا اور نہ اس پر غور کیا، کیونکہ وہ ''بے وقوف'' تھے اس لیے انھوں نے پہلے یہ پوچھا کہ اس چیز میں، جو وہ بس معلوم کرنے ہی والے ہیں، کیا اچھائی ہے، کیونکہ وہ

''بے وقوف'' تھے انھیں تفصیلات سے نہیں بلکہ خلاصوں سے دلچسپی تھی، کیونکہ وہ ''بیوقوف'' تھے اس لیے ایک جیسے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے بھی لوگوں کی اس طرح نکتہ چینی کرنے کا شوق تھا، بہت سالوں پہلے نہیں، جب میں ابھی اپنے وطن میں مقیم تھا، میں خوجہ کے جواب میں کچھ نہ کہتا۔ بہرکیف اس وقت اس کی ساری توجہ پر بے وقوف مسلط تھے، میں نہیں۔ بظاہر میری نادانی دوسری قسم کی تھی۔ ان دنوں میں اپنی بداحتیاطی کی بنا پر میں نے اس سے اپنے ایک خواب کا ذکر کر دیا تھا: وہ میری بجائے میرے ملک گیا ہوا ہے، میری منگیتر سے شادی رچا رہا ہے، شادی میں کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ میں نہیں ہوں، اور خوش خرمیوں کے دوران، جو میں ایک ترک کا لباس پہنے ایک کونے میں کھڑا دیکھ رہا ہوں، میں اپنی ماں اور اپنی منگیتر سے جا ملتا ہوں، جو دونوں مجھے پہچانے بغیر میری طرف اپنی پیٹھ موڑ لیتی ہیں، ان آنسوؤں کے باوجود جنھوں نے مجھے خواب سے بیدار کر دیا۔

اسی زمانے کے آس پاس وہ پاشا کی حویلی میں دو بار گیا۔ میرا خیال ہے پاشا اس پر ناخوش تھا کہ خوجہ اس کی چشمِ نگراں سے دور حاکم سے تعلق پیدا کر رہا ہے؛ اس نے اس سے پوچھ گچھ کی؛ اس نے میرے بارے میں استفسار کیا، وہ میری تفتیش کر رہا تھا، لیکن بہت بعد ہی میں کہیں جا کر، جب پاشا کو استنبول بدر کر دیا گیا تھا، خوجہ نے مجھ پر یہ کھولا: اسے خدشہ تھا کہ اگر مجھے پتا چل گیا ہوتا تو شاید زہر دے دیے جانے کی دہشت میں میرے دن گزرتے۔ تاہم میں دیکھ سکتا تھا کہ پاشا کو خوجہ کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ دلچسپی تھی؛ اس سے میرے احساسِ فخر کو تقویت پہنچی کہ خوجہ اور میرے درمیان پائی جانے والی مشابہت مجھ سے زیادہ خود پاشا کے لیے پریشان کن ہے۔ ان دنوں ایسا لگتا کہ یہ مشابہت وہ راز ہے جو خوجہ کبھی جاننے کا خواہشمند نہیں تھا اور جس کے وجود نے مجھے ایک عجیب سی ہمت بخش دی تھی: کبھی کبھی میں سوچتا کہ محض اس مشابہت کی بنا پر جب تک خوجہ زندہ ہے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچنے والی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب خوجہ کہتا کہ پاشا بھی انھیں جیسا ایک بے وقوف ہے، تو میں اس کی تردید کرتا؛ وہ اس پر پیٹ بھر کر جز بز ہوتا۔ اس نے مجھے ایسی گستاخی پر اکسایا جس کا میں عادی نہیں تھا، میں چاہتا تھا

کہ اس کے لیے اپنی ضرورت اور اپنے سامنے اس کی ندامت دونوں ہی محسوس کروں: میں اس سے پاشا کے بارے میں تابڑتوڑ سوال کرتا، اس کے بارے میں جو اس نے ہم دونوں کے بارے میں کہا ہو، خوجہ کو ایسے دم گھونٹتے ہوئے طیش میں ڈال کر جس کا سبب، میرا خیال ہے، خود اس کے اوپر بھی واضح نہیں تھا۔ پھر وہ بڑی اکڑ کے ساتھ دہراتا کہ وہ پاشا کا بھی صفایا کر دیں گے، جلد ہی ینی چری [ترکی کا محافظ دستہ] جلد ہی کچھ کر گزرنے والے ہیں، اسے محل کے اندر سازشوں کی سن گن ہو رہی ہے۔ اسی کے باعث، اگر وہ پاشا کی ایما پر ایک ہتھیار پر کام کرنے ہی والا ہے، تو یہ اسے کسی وزیر کے لیے نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ وزیر آتے جاتے رہتے ہیں، بلکہ خود سلطان کے لیے۔

تھوڑی دیر کے لیے مجھے خیال ہوا کہ وہ ہتھیار کے اس مبہم سے تصور میں پوری طرح ڈوبا ہوا ہے؛ منصوبہ بنا رہا ہے لیکن کہیں رسائی نہیں ہو رہی، میں نے اپنے سے کہا۔ کیونکہ اگر اس معاملے میں اس نے کوئی پیش رفت کی ہوتی، تو مجھے یقین ہے اس نے اس میں مجھے شریک کیا ہوتا، خواہ اس بیان سے اس کا مقصد میری ہیٹی کرنے کی کوشش ہی ہوتا۔ اس نے مجھے اپنے نمونوں کے بارے میں بتایا ہوتا تاکہ میری رائے معلوم کر سکے۔ ایک شام ہم اُکسرائے میں اس مکان سے لوٹ رہے تھے جہاں ہم موسیقی سنتے اور طوائفوں کے ساتھ پڑے رہتے، جیسا کہ ہم ہر دوسرے تیسرے ہفتے کرنے کے عادی تھے۔ خوجہ نے کہا کہ وہ صبح تک کام کرنے کا ارادہ باندھ رہا ہے، پھر مجھ سے عورتوں کے بارے میں پوچھا — ہم نے عورتوں کے بارے میں کبھی گفتگو نہیں کی تھی — اور ناگہانی بولا، ''میں سوچ رہا ہوں ...؟'' لیکن جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا بغیر یہ بتائے کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ میں اپنی کتابوں کے ساتھ رہ گیا جن کی محض ورق گردانی کی بھی مجھے اب کوئی خواہش نہیں رہی تھی، اور اس کے بارے میں سوچا: اس کی بابت کہ اس کا منصوبہ یا تصور، خواہ یہ کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھا سکے گا، اس کی بابت کہ وہ کمرے میں بند میز کے پاس بیٹھا ہے جس سے وہ ہنوز پوری طرح مانوس نہیں ہو سکا ہے، اپنے سامنے خالی صفحوں کو گھور رہا ہے، گھنٹوں تک

میز کے پاس شرم اور طیش کے علم میں بیٹھا ہے…

نصف شب کے بہت بعد کہیں وہ اپنے کمرے سے برآمد ہوا اور وہ بھی کسی شرمسار طالبِ علم کی طرح جسے گرفت میں نہ آنے والے کسی معمولی سے نکتے کو حل کرنے کے لیے مدد کی ضرورت ہو، اور مجھے کھسیانے انداز میں اندر میز کے پاس آنے کے لیے کہا۔ ''میری مدد کرو،'' اس نے اچانک کہا۔ ''چلو ساتھ ساتھ ان کے بارے میں سوچیں، میں اکیلا آگے نہیں بڑھ سکتا۔'' میں کچھ دیر خاموش رہا، سوچتا رہا کہ اس کا تعلق عورتوں سے ہو۔ مجھے خالی خالی دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا، ''میں بے وقوفوں کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ وہ اس قدر احمق کیوں ہوتے ہیں؟'' پھر، جیسے جانتا ہو کہ میرا جواب کیا ہوگا، اس نے اضافہ کیا، ''اچھا ٹھیک ہے، وہ احمق نہیں ہیں، تاہم کچھ نہ کچھ ان کے دماغ سے ضرور غائب ہوتا ہے۔'' میں نے نہیں پوچھا کہ ''ان'' سے اس کی مراد کون ہیں۔ ''کیا ان کے سروں کے اندر کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جہاں علم کی ذخیرہ اندوزی کی جا سکے؟'' اس نے کہا، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے صحیح لفظ کی تلاش میں ہو۔ '' ان کو چاہیے کے سروں کے اندر ایک خانہ رکھیں، اس الماری کی درازوں جیسا کوئی خانہ، ایک ٹھکانہ جہاں وہ متفرق چیزیں رکھ سکیں، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایسی کوئی جگہ نہیں۔ تم سمجھے؟'' میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ ایک آدھ بات سمجھا ہوں، لیکن اس میں ٹھیک سے کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ ''بہر کیف، کون جان سکتا ہے کہ ایک آدمی کیوں ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ہے؟'' اس نے آخر کار کہا۔ ''آہ، کاش تم واقعی طبیب ہوتے اور مجھے سکھاتے؛'' اس نے بیان جاری رکھا، ''ہمارے جسموں کے بارے میں اور ہمارے سروں کے بارے میں۔'' وہ کچھ شرمسار لگ رہا تھا۔ شگفتہ خاطری کی ادا سے، جو میرے خیال میں اس نے محض خالی خولی اپنے پر اس لیے طاری کی تھی کہ کہیں مجھے خوفزدہ نہ کر دے، اس نے اعلان کیا کہ وہ اس سے دست کش ہونے والا نہیں، وہ انتہا تک جائے گا، نہ صرف اس لیے کہ اسے کیا ہوگا کا تجسس ہے بلکہ اس لیے بھی کہ کچھ کرنے کے لیے نہیں ہے۔ میری سمجھ میں خاک نہ آیا، لیکن مجھے اس بات سے طمانیت ہوئی کہ یہ سب اس نے

مجھی سے سیکھا ہے۔

بعد میں اس نے اکثر یہی بات دہرائی، گویا ہم دونوں ہی اس کا مطلب جانتے ہوں۔ لیکن تیقن کا سوانگ رچانے کے باوجود، اس کے انداز میں دن سپنے دیکھنے والے طالب علم کے سوال پوچھنے کی ادا تھی؛ ہر بار وہ یہی کہتا کہ انتہا تک جائے گا اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ کسی بد قسمت عاشق کے افسردہ اور برہم نالے سن رہا ہوں جو یہ پوچھ رہا ہو کہ یہ آزار اسے کیوں اور کیسے لاحق ہوا۔ ان دنوں میں وہ یہ بات بار بار کہتا؛ یہ اس نے اس وقت بھی کہا جب اسے علم ہوا کہ ینی چیری ایک بغاوت کی گٹھ جوڑ کر رہے ہیں، اور تب بھی جب اس نے بتایا کہ ابتدائی اسکول کے طالبِ علموں کو ستاروں سے زیادہ فرشتوں سے دلچسپی تھی، اور اس کے بعد جب ایک اور قلمی نسخہ جس کی اس نے اچھی خاصی قیمت ادا کی تھا طیش میں ایک طرف پھینک دیا گیا جب کہ ابھی اس نے اسے نصف کے قریب ہی پڑھا تھا، مسجد کے اطاق الساعۃ میں اپنے دوستوں سے جدا ہونے کے بعد جن سے اب وہ محض ایک عادت کے طور پر ملتا تھا، ناقص طور پر گرم کیے ہوئے حماموں میں ٹھٹھرنے کے بعد، بستر پر پھولدار توشک پر بکھری ہوئی اپنی محبوب کتابوں کے درمیان پسرنے کے بعد، مسجد کے صحن میں وضو کرنے والوں کی احمقانہ بک بک سننے کے بعد، یہ جاننے کے بعد کہ بیڑے کو اہلِ وینِس نے شکست دے دی ہے، بڑے تحمل سے پڑوسیوں کو سننے کے بعد جو یہ کہنے کے لیے آئے ہوتے کہ اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے اور اسے شادی کر لینی چاہیے، اس نے پھر یہی بات دہرائی: وہ انتہا تک جائے گا۔

اب میں تعجب کرنے لگتا ہوں: کون، ایک بار جو میں نے تحریر کیا ہے اسے آخر تک پڑھ لینے کے بعد، جو ہوا، یا جو میں نے تصور کیا کہ ہوا، اس کا جس قدر بھی میں بیان کر سکا ہوں، صبر و سکون سے سمجھ لینے کے بعد، کون قاری کہہ سکتا ہے کہ خوجہ نے جو واعدہ کیا تھا اسے وفا نہ کیا؟

(٤)

گرما کے اختتام کے قریب ایک دن یہ سنا گیا کہ شاہی نجومی حسین افندی کا مردہ جسم اِستِنیے کے ساحل کے قریب بہتا ہوا پایا گیا ہے۔ آخر کار پاشا نے اس کی موت کا پروانہ حاصل کرلیا تھا، اور نجومی نے، جو خاموش نہ رہ سکا، اپنی جائے پناہ کی چغلی دور وقریب خط بھیج کر کھادی جن میں صادق پاشا کے جلد اپنی موت سے ہمکنار ہونے کی پیشین گوئی تھی، یہ ستاروں میں لکھا ہوا تھا۔ جب اس نے اناطولیہ فرار ہونے کی کوشش کی تو جلادون نے اس کی کشتی کو جالیا اور اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جیسے ہی خوجہ کو پتا چلا کہ مرنے والے کی ملکیت سرکاری قبضے میں لے لی گئی ہے، تو وہ اڑ کر اس کے کاغذات اور کتابوں پر قبضہ جمانے پہنچ گیا؛ اس پر اسے اپنا سارا اندوختہ رشوتوں کی نذر کرنا پڑا۔ ایک شام وہ ایک بڑا سا صندوق گھر لایا جو ہزاروں صفحات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور محض ہفتے کے اندر اندر انھیں ہضم کرنے کے بعد برہمی سے بولا کہ اس سے بہتر تو وہ کرسکتا ہے۔

اپنے قول کو نبھانے پر اس کی کاوش میں مَیں نے اس کی اعانت کی۔ ان دو رسالوں کے واسطے، بعنوان ''جانوروں کے عجیب طور وطریق'' اور ''مخلوقِ خدا کے حیرت انگیز عجائب،'' جنھیں اس نے حاکم کے لیے مدون کرنے کا فیصلہ کیا تھا، میں نے نفیس گھوڑوں اور گدھوں،

خرگوشوں، اور چھپکلیوں کا نقشہ بیان کیا جنھیں میں نے ایمپولی (Empoli) میں ہماری اراضی کے وسیع وعریض باغات اور مرغزاروں میں مشاہدہ کیا تھا۔ جب خوجہ نے کہا کہ میری قوتِ متخیلہ بے حد محدود ہے، تو مجھے اپنے کنول کے تالاب کے فرانسیسی مونچھ دار کچھوے یاد آئے، نیلے توتے جو سِسلی کے لہجے میں گفتگو کرتے تھے، اور گلہریاں جو جفت سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھیں چونچ سے اپنے سموروں کو نک سکھ سے درست کررہی ہوتیں۔ ہم نے چیونٹیوں کے طرزِ عمل سے متعلق باب پر کافی توجہ اور وقت صرف کیا، وہ موضوع جس نے سلطان کا دل لبھایا تو لیکن جس کے بارے میں وہ زیادہ معلوم نہ کرسکا کیونکہ پہلے صحن کو مستقل جھاڑو دی جارہی تھی۔

جب خوجہ چیونٹیوں کی باقاعدہ اور منطقی زندگی کے بارے میں اپنے خیلات قلمبند کررہا تھا، اس نے اس خواب کی بھی پرورش کی کہ ہمیں نوجوان سلطان کو تربیت بہم پہنچانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اپنی مقامی سیاہ چیونٹیوں کو ناکافی پاکر، اس نے سرخ امریکی چیونٹیوں کا طرزِ عمل بیان کیا۔ اس سے اسے ست الوجود قدیم باشندوں کے بارے میں، جو اس سانپوں سے اٹے ہوے ملک میں جسے امریکا کہا جاتا ہے رہتے تھے اور اپنے اطوار کبھی نہیں بدلے تھے، ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال آیا جو دل بہلانے والی اور معلوماتی دونوں ہی ہو: میرا خیال ہے یہ کتاب اس نے کبھی مکمل کرنے کی جرأت نہیں کی جس میں اس نے کہا تھا، جیسا کہ اس نے میرے لیے تفصیل سے بیان کیا، کہ وہ یہ بھی لکھے گا کہ کس طرح ایک طفل بادشاہ کو جو جانوروں اور شکار کا شوقین تھا ہسپانوی کفار نے سولی پر چار چوب کردیا تھا کیونکہ اس نے سائنس کی طرف سے غفلت برتی تھی۔ پروں والی بھینسوں، شش پایہ بیلوں، اور دوسَرے سانپوں کے جو خاکے ہم نے ایک منیچرسٹ سے انھیں جیتی جاگتی شکل دینے کے لیے بنوائے تھے، ان سے ہم دونوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ ''ہوسکتا ہے حقیقت پرانے وقتوں میں اتنی ہی سپاٹ رہی ہو،'' خوجہ نے کہا۔ ''لیکن آج ہر شے سہ بُعدی ہے، حقیقت کی پرچھائیاں ہیں، تم دیکھتے ہو؛ حتیٰ کہ ادنیٰ ترین چیونٹی ایک توام کی طرح اپنی پرچھائیں کو بڑے صبر وتحمل سے اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتی ہے۔''

سلطان کی جانب سے خوجہ کو کوئی سندیسہ نہیں آیا، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ پاشا سے

کہے کہ وہ رسائل اس کی جانب سے پیش کردے، لیکن بعد میں اس پر پچھتایا۔ پاشا نے اسے اچھا خاصا واعظ سنا دیا، یہ کہا کہ علم نجوم سوفسطائیت ہے، کہ شاہی نجومی حسین افندی اپنی بساط سے زیادہ سیاست میں ملوّث ہوگیا ہے اور کہ اسے گمان تھا کہ اب خوجہ کی آنکھیں اس کے خالی کردہ عہدے پر جمی ہوئی ہیں، کہ وہ خود اس چیز میں جسے سائنس کہتے ہیں اعتقاد رکھتا ہے لیکن معاملہ ہتھیاروں کا تھا، ستاروں کا نہیں، کہ شاہی نجومی کا عہدہ بڑا منحوس ہے جیسا کہ اس بات سے واضح ہے کہ جو بھی اس پر فائز ہوے جلد یا بدیر قتل کردیے گئے، یا بدتر یہ کہ، ہوائے رقیق میں تحلیل ہوگئے، اور چنانچہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا پیارا خوجہ، جس کی سائنس پر وہ اعتماد کرتا ہے، اس کا عہدہ سنبھالے، اور کہ، ہو نہ ہو، نیا شاہی نجومی صدقی افندی ہوگا، جو اس قدر سادہ لوح اور احمق ہے کہ یہ کام کرسکے، کہ اس نے سنا ہے خوجہ نے سابق نجومی کی کتابیں حاصل کرلی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ خوجہ مزید اس معاملے سے سروکار نہ رکھے۔ خوجہ نے جواب میں کہا کہ اس کا سروکار تو بس سائنس ہی سے ہے اور پاشا کو وہ رسائل پکڑا دیے جنھیں وہ سلطان کو پہنچوانا چاہتا تھا۔ اس شام گھر پر اس نے کہا کہ بیشک اس کا سارا سروکار سائنس سے ہی ہے، لیکن ہر وہ چیز جو اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہو اسے کرے گا؛ اور آغاز کے طور پر، پاشا پر نفرین بھیجی۔

اگلے ماہ کے دوران ہم نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ بچے پر ہمارے رنگ برنگے تخیلی جانوروں کا کیا ردعمل ہوا، اور خوجہ اس تمام عرصے میں اس تخمین وظن میں رہا کہ اسے ابھی تک محل کیوں نہیں بلایا گیا ہے۔ آخرکار ہماری شکار پر طلبی ہوئی۔ ہم دریائے کُرت خانے کے کنارے پر مراہُور محل پہنچے، وہ حاکم کے پہلو میں کھڑے ہونے، اور میں دور سے دیکھنے کے لیے۔ کافی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شاہی داروغۂ شکار نے اچھا انتظام کیا تھا: خرگوش اور لومڑیاں چھوڑ دی گئی تھیں اور ان کے تعاقب میں گرے ہاؤنڈ کتے، ہم دیکھتے رہے جبکہ دوسری تمام نگاہیں اس خرگوش پر لگی ہوئی تھیں جو اپنی جماعت سے بچھڑ کر دریا میں میں کود پڑا تھا؛ جب، دیوانہ وار تیرتے ہوے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا؛ داروغے وہاں بھی کتے چھوڑنا چاہتے

تھے، لیکن اس فاصلے سے جہاں ہم ایستادہ تھے سن سکتے تھے کہ حاکم نے اس حکم کے ساتھ منع کیا: ’’خرگوش کو آزاد رہنے دو۔‘‘ تاہم، خرگوش پھر پانی میں کود پڑا اور دوسرے کنارے کے ایک آوارہ کتے نے اس کا پیچھا کرکے دبوچ لیا، لیکن داروغے اسے کتے کے جبڑوں سے نجات دلانے کے لیے دوڑ پڑے اور اسے لیے سلطان کے حضور میں پہنچے۔ بچے نے خرگوش کا فوراً معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر کہ زخم کاری نہیں ہیں اطمینان کا سانس لیا؛ اس نے حکم دیا کہ خرگوش کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔ پھر میں نے خوجہ اور اس سرخ سر بونے کو حاکم کے گرد جمع ہوتے دیکھا۔

اس شام خوجہ نے بتایا کہ کیا ہوا تھا: سلطان نے پوچھا تھا کہ اس واقعے کی کیا تعبیر ہونی چاہیے۔ جب سب بول چکے اور خوجہ کی باری آئی تو وہ بولا کہ اس کا مطلب ہے سلطان کے دشمن ایسی کمین گاہوں سے آئیں گے جن کا اسے کمتر گمان ہوگا، لیکن وہ خطرے سے زندہ سلامت بچ نکلے گا۔ جب خوجہ کے حریفوں نے، جن میں نیا شاہی نجومی صدقی افندی بھی شامل تھا، اس تعبیر پر نکتہ چینی کی کہ اس میں موت کا ذکر چھیڑا گیا ہے — بلکہ یہاں تک کہ حاکم کو خرگوش سے تشبیہ دی ہے — سلطان نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ وہ خوجہ کے بیان کو اپنے کان کا آویزہ سمجھتا ہے۔ بعد میں، جب وہ ایک کالے شاہین کو، جس پر شکرے حملہ آور ہوے تھے، اپنی جان کی خاطر برسرِ پیکار دیکھ رہے تھے، اور ایک لومڑی کی قابلِ رحم موت کا منظر بھی دیکھا جسے بھوکے کتوں نے بھنبھوڑ ڈالا تھا، سلطان نے بتایا کہ اس کی شیرنی نے دو بچے دیے ہیں، ایک نر، دوسرا مادہ، ایک مساوی تعداد، جیسا کہ خوجہ نے پیش گوئی کی تھی، کہ اسے خوجہ کی bestiary [اخلاقی تلقین پر مبنی قرونِ وسطیٰ کا مقالہ اصلی اور فرضی جانوروں کی بابت] سے الفت ہے، اور بیلوں کی بابت پوچھا جن کے نیلے پر ہوتے ہیں، اور گلابی بلیوں کی بابت جو دریائے نیل کے قریب مرغزاروں میں رہتی ہیں۔ فتحمندی اور خوف کے عجیب ملے جلے احساس سے خوجہ مدہوش ہوگیا۔

بہت بعد ہی میں ہمیں اس شیطنت کا پتا چلا جو محل میں واقع ہوئی: سلطان کی دادی کوسم

سلطانہ نے ینی چیری آغاؤں کے ساتھ مل کر اسے اور اس کی والدہ کو مار ڈالنے اور اس کے بجائے اس کے بھائی شہزادہ سلیمان کو تخت نشین کرنے کی ساز باز کی، لیکن سازش ناکام ہو گئی۔ پاداش میں دادی کا گلا اس بری طرح گھونٹ دیا گیا کہ منہ اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ یہ سب خوجہ کو مسجد کے اطاق الساعۃ میں ان احمقوں کی گپ شپ سے معلوم ہوا۔ وہ مکتب میں پڑھاتا رہا، لیکن اس کے علاوہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔

موسم خزاں میں کچھ عرصے کے لیے اس نے اپنی کوسموگرافیکل نظریات پر غور و فکر کرنے کا ارادہ کیا لیکن دوبارہ بے یقین ہو کر ہاتھ کھینچ لیا: اسے ایک رصدگاہ کی ضرورت تھی؛ بنابریں، یہاں کے احمقوں کو ستاروں سے اتنی ہی کم دلچسپی تھی جتنی خود ستاروں کو ان احمقوں سے۔ سردیاں آئیں، آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے، اور ایک دن ہمیں اطلاع ملی کہ پاشا کو اپنے عہدے سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ تجویز تو اس کا گلا گھونٹنے کی بھی تھی، لیکن سلطان کی والدہ نے اس کی اجازت نہیں دی، چنانچہ اس کے بجائے اسے ایرزِنجان شہربدر کر دیا گیا اور اس کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ اس کے مرنے تک اس کی بابت مزید کوئی خبر نہیں ملی۔ خوجہ نے اعلان کیا کہ اب اسے کسی کا ڈر نہیں رہا، وہ کسی کا مقروض نہیں ہے — مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہتے وقت اس نے اس بات کو کس قدر نظر میں رکھا تھا کہ اس نے مجھ سے کچھ سیکھا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اسے نہ طفل کا خوف تھا نہ طفل کی ماں کا۔ وہ موت اور ناموری سے جوا کھیلنے کے لیے تیار تھا، لیکن ہم گھر میں اپنی کتابوں کے درمیان بھیڑوں کی طرح خاموش بیٹھے رہے، سرخ امریکی چیونٹیوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور اس موضوع پر ایک نیا مقالہ لکھنے کا خواب دیکھتے رہے۔

وہ سردیاں، بہت سی گزشتہ اور آئندہ سردیوں کی طرح، ہم نے گھر ہی پر گزاریں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کڑکڑاتی سرد راتوں میں جب بادِشمالی چمنیوں اور دروازوں کے نیچے سے در آتی، ہم زیریں منزل میں بیٹھے صبح ہونے تک باتیں کرتے رہتے۔ وہ اب مزید میری خفت نہیں کرتا تھا، اور اگر کرتا بھی ہو تو اس کے اظہار کی پروا نہیں رہی تھی۔ اس کے اس نئے نئے جذبۂ

رفاقت کو میں نے اس حقیقت پر محمول کیا کہ اب کوئی اس کا طلبگار نہیں رہا ہے، نہ محل میں نہ محل سے متعلق حلقے میں۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا کہ ہماری پراسرار مشابہت کا اسے بھی اتنا ہی احساس ہے جتنا مجھے، اور اس بات سے مجھے پریشانی ہوتی کہ اب جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو اسے وہ خود نظر آتا ہے: وہ کیا سوچ رہا ہے؟ ہم نے جانوروں کی بابت ایک اور طویل مقالہ نمٹا دیا تھا، لیکن یہ پاشا کی جلاوطنی کے وقت سے میز پر پڑا ہوا تھا، اور خوجہ اس پر مصر تھا کہ وہ ان لوگوں کے ناز نخرے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جن کی محل تک رسائی ہے۔ گاہے گاہے، بے کار پڑے پڑے، کیونکہ ایام کسی قابلِ ذکر واقعے کے بغیر گزر رہے تھے، میں مقالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بنفشئی ٹڈوں اور اڑنے والی مچھلیوں کو دیکھتا جن کی تصویریں خود میں نے بنائی تھیں، اور سوچتا کہ اگر سلطان پڑھتا تو کیا خیال کرتا۔

بہار کی آمد پر ہی کہیں جا کر خوجہ کو بلاوا آیا۔ اسے دیکھ کر بچے کو بڑی مسرت ہوئی تھی؛ بقول خوجہ، سلطان کی ہر جنبش، اس کے ہر لفظ سے عیاں تھا کہ وہ بڑی دیر سے اس کا منتظر تھا، لیکن اس کے احمق درباریوں نے اسے خوجہ کو بلا بھیجنے سے باز رکھا۔ حاکم نے اپنی دادی کی غداری کا ذکر کیا، بولا کہ خوجہ نے خطرے کی بو پہلے ہی سونگھ لی تھی اور یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ سلطان بغیر گزند پہنچے زندہ بچ نکلے گا۔ اُس رات جب بچے نے ان لوگوں کی چیخ و پکار سنی جو اسے قتل کرنے کی نیت سے آئے تھے، تو ذرہ برابر بھی خوفزدہ نہیں ہوا، کیونکہ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ نابکار کتا اپنے جبڑوں میں آئے ہوئے خرگوش کو ایذا نہیں پہنچا سکا تھا۔ تحسین آفرینی کے ان الفاظ کے بعد اس نے حکم دیا کہ ایک مناسب قطعۂ ارض سے وصول ہونے والی آمدنی خوجہ کو وقف کر دی جائے۔ فلکیات کا موضوع چھیڑنے سے پہلے ہی خوجہ کو لوٹنا پڑا؛ اس سے کہا گیا کہ گرما کے ختم پر عطیے کا متوقع رہے۔

انتظار کرتے ہوئے، زمین کی آمدنی کی توقع میں خوجہ نے باغ میں ایک چھوٹی سی رصدگاہ کی تعمیر کا منصوبہ بنا ڈالا۔ اس نے بنیادوں کی کھدائی کی حدود کا حساب لگایا اور ان آلات کی قیمت کا جو اسے درکار ہوں گے، لیکن اس بار وہ بہت جلد ہی اس میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھا۔

اسی زمانے میں ایک بڑی بری طرح نقل کیا ہوا مخطوطہ پرانے کتاب بازار میں۔ اس کے ہتھے چڑھا، جس میں تقی الدین کے مشاہدات کا اندراج تھا۔ اس نے ان مشاہدات کی صحت کی آزمائش میں دو مہینے لگائے، لیکن آخراً بیزار ہوکر سلسلہ منقطع کردیا، کیونکہ وہ اس کا تعین کرنے میں ناکام رہا تھا کہ کون سی تقصیر اس کے کم تر آلات کے باعث تھی، کون سی خود تقی الدین کی غلطیوں پر مبنی تھی، اور کون سی خطاط کی لاپروائی کا نتیجہ تھی۔ جس چیز نے اسے اور زیادہ برہم کیا وہ اشعار تھے جو مخطوطے کے کسی سابق مالک نے مثلثات کی عمودی جدولوں [trigonometric columns]، جنھیں ساٹھ ڈگری پر تقسیم کیا گیا تھا، کے بیچ میں گھسیٹ دیے تھے۔ اس سابق مالک نے، حروف ابجدی کے حساب اور دوسرے طریقوں کے استعمال سے، دنیا کے مستقبل کے بارے میں اپنے ناچیز خیالات پیش کیے تھے: چار لڑکیوں کے بعد، بالآخر، اس کے یہاں ایک لڑکے کی ولادت ہوگی، ایک طاعون پھیلے گا جو معصوموں کو مجرموں سے ممیز کرے گا، اور اس کا پڑوسی بہاء الدین افندی موت سے ہم آغوش ہوگا۔ اگرچہ شروع میں خوجہ ان پیش گوئیوں سے محظوظ ہوا، لیکن بعد میں کافی متوحش ہوگیا۔ اب وہ ہمارے سروں کے اندر کے بارے میں ایک عجیب اور نامبارک اعتماد سے باتیں کرنے لگا تھا، یا ہمارے کمرے کی الماریوں کے بارے میں۔

سلطان نے جس عطا کا واعدہ کیا تھا گرمیوں کے ختم پر نہیں پہنچی، نہ سردیوں کی آمد پر۔ اگلے سال خوجہ کو بتایا گیا کہ ایک نیا کھاتا تیار کیا جارہا ہے؛ اسے انتظار کرنا چاہیے۔ اس دوران اسے محل بلوایا گیا، لیکن اکثر نہیں، تاکہ اس قسم کے مظاہر کے بارے میں اپنی تعبیرات پیش کرے جیسے وہ آئینہ جس میں دراڑ پڑ گئی، بجلی کا سبز کوندا جو جزیرۂ یاسہ کے گرد سمندر پر گرا، چیری کے عرق سے لبریز بلوریں مینا جو اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پاش پاش ہوگئی، اور آخری مقالے میں جانوروں سے متعلق حاکم کے استفسارات کا جواب۔ جب وہ گھر لوٹتا تو کہتا کہ حاکم بلوغت میں داخل ہورہا ہے؛ یہ آدمی کی زندگی کا سب سے زیادہ اثر پزیر دور ہوتا ہے، کوئی دم جاتا ہے کہ طفل اس کی مٹھی میں ہوگا۔

اس مقصد کو ذہن میں رکھ کر اس نے ایک بالکل نئی کتاب کی تصنیف پر کام شروع کردیا۔ اس نے مجھ سے ازٹیکس (Aztec) کے زوال کے بارے میں سن رکھا تھا، اور اس سے بہت پہلے ہی اس کے ذہن میں ایک قابلِ رحم طفل بادشاہ کی کہانی تھی جسے سولی پر اس لیے چارچوب کردیا گیا تھا کہ اس نے سائنس کی طرف سے غفلت برتی تھی۔ وہ اکثر ان بداخلاق ذلیلوں کا ذکر کرتا جو اپنی توپوں اور جنگی مشینوں، اپنے پرفریب قصے کہانیوں اور ہتھیاروں کے ساتھ محوِ خواب شرفا پر شب خون مارتے اور انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کردیتے؛ لیکن ایک مدت تک اس نے جو وہ خود کو بند کیے ہوئے لکھ رہا تھا مجھ سے چھپائے رکھا۔ مجھے معلوم تھا وہ چاہتا ہے کہ پہلے میں دلچسپی کا اظہار کروں، لیکن اس زمانے میں شدید یادِ وطن نے، جو یکبارگی مجھے بڑی غیر معمولی افسردگی میں غرق کر دیتی، میری اس سے نفرت کو فزوں تر کردیا تھا؛ میں اپنے تجسس کو دبا دیتا، یہ ظاہر کرتا کہ مجھے ان خاک آلود پھٹی جلدوں والی کتابوں سے ذرا دلچسپی نہیں ہے جنھیں وہ اس لیے پڑھتا ہے کیونکہ وہ اسے ارزاں قیمت پر مل گئی تھیں، اور ان نتائج پر حقارت کا اظہار کرتا جو اس کی تخلیقی عقل نے مجھ سے سیکھی ہوئی باتوں سے برآمد کیے تھا۔ روز بروز اس کا اعتماد گھٹنے لگا، پہلے خود اپنے پر، پھر اس پر جو وہ ضابطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کررہا تھا، جبکہ میں اس مدت میں انتقامی تلذلذ سے مشاہدہ کرتا رہا۔

وہ اوپر اس چھوٹے سے کمرے میں جاتا جسے اس نے اپنی ذاتی مطالعہ گاہ بنایا ہوا تھا، ہماری میز کے سامنے بیٹھتا جو میں نے بنوائی تھی، اور سوچتا، لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ کچھ لکھ لکھا نہیں رہا، مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ نہیں لکھ سکتا؛ مجھے معلوم تھا کہ اس میں اس بات کی جرأت نہیں کہ اپنے خیالات پر بغیر پہلے میری رائے معلوم کیے ہوئے کچھ تحریر کرسکے۔ اصل میں یہ میرے حقیر خیالات کی احتیاج نہیں تھی، جس پر وہ بناوٹی استہزا کا اظہار کرتا تھا، اور جو اس کے اپنے اوپر اعتماد کو متزلزل کردیتی تھی، بلکہ وہ واقعی جس چیز کا حاجت مند تھا وہ یہ کہ ''ان کا'' کیا خیال تھا، ان کا جو میری طرح کے لوگ تھے، وہ ''دوسرے'' جنھوں نے مجھے وہ ساری سائنس سکھائی تھی، علم سے لبریز وہ خانے، وہ درازیں میرے سر میں رکھ دی تھیں۔ اگر وہ اس صورتِ حال

سے درپیش ہوتے تو، کیا سوچتے؟ بس حقیقت میں یہی تھا جو وہ پوچھنے کے لیے مرا جا رہا تھا، لیکن پوچھنے پر اپنے کو آمادہ نہ کر سکا۔ میں نے اس بات کا کس قدر انتظار کیا کہ وہ اپنے گھمنڈ کو پی کر مجھ سے یہ سوال دریافت کرنے کی جرأت پیدا کر سکے! لیکن اس نے نہیں پوچھا۔ جلد ہی اس نے اپنی کتاب چھوڑ چھاڑ دی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اسے مکمل کر لیا تھا یا نہیں، لیکن اس نے ''بیوقوفوں'' سے متعلق اپنے اسی پرانے ٹیپ کے مصرعے کی گردان از سرِ نو شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے یقین سے، کہ قابلِ عمل بنیادی سائنس وہی تھی جو ان کی حماقت کے سبب کا تجزیہ کرے، دست بردار ہونے والا تھا؛ یہ معلوم کرنے کی خواہش سے دست بردار ہونے والا تھا کہ ان کے سر اندر سے کیوں ایسے تھے جیسے کہ تھے، اور اس کی بابت مزید غور و فکر سے بھی! میرا خیال ہے یہ سوچ بچار اس کی مایوسی کا زائیدہ تھا کیونکہ الطاف و کرم کی وہ نشانیاں جن کا وہ محل کی جانب سے متوقع تھا نمودار ہو کر نہ دیں۔ وقت بے سود ہی گزرتا رہا، حاکم کی بلوغت سے بہر حال بہت زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔

لیکن کُپرُولُو محمد پاشا کے وزیر ہونے سے پہلے کی گرمیوں میں، خوجہ کو انجام کار اپنا عطیہ مل ہی گیا؛ اور یہ عطیہ بھی ایسا جو خود اس نے منتخب کیا ہو: اسے گیبزے کے قریب دو چکیوں اور اس شہر سے گھنٹہ بھر کی مسافت پر دو گاؤں کی مجموعی آمدنی بخشی گئی تھی۔ فصل کٹنے کے وقت ہم گیبزے پہنچے، اور اپنے پرانے گھر میں وارد ہوئے جو اتفاق سے خالی پڑا تھا، لیکن وہ ان مہینوں کو بھول بھال گیا تھا جو ہم نے وہاں گزارے تھے، وہ دن جب اس نے اس میز کی طرف جو میں بڑھئی سے بنوا کر لایا تھا بڑی ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ گھر کے ساتھ ہی ساتھ اس کی یادیں بوڑھی اور بدنما ہو چکی ہوں: کچھ بھی سہی، ایک بے صبری نے اسے اتنا مغلوب کر لیا تھا کہ ماضی کی کسی شے کے بارے میں پروا کرنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ چند موقعوں پر وہ گاؤں کے معائنے کے لیے گیا؛ اس نے اس آمدنی کا حساب لگایا جو گزشتہ برسوں میں ہوئی ہوگی، اور تَرہُونجو احمد پاشا کے زیرِ اثر، جس کے بارے میں اس نے اپنے مسجد کے اطاق الساعۃ والے دوستوں کی گپ بازی کے دوران سنا تھا، یہ اعلان کیا کہ اس نے حساب کتاب کے دفتر کے

واسطے ایک نیا نظام دریافت کیا ہے جو زیادہ آسان اور زیادہ قابلِ فہم طریقے پر یہ کام کر سکے گا۔

لیکن اس اختراع کی جدت طرازی اور فائدہ مندی، جس پر اسے خود یقین نہیں تھا، اس کے لیے کافی نہیں تھی: ان راتوں نے، جو اس نے پرانے گھر کے پائیں باغ میں بیٹھ کر آسمان کو تکنے میں برباد کیں، فلکیات میں اس کے جنون کو پھر جگا دیا۔ کچھ دیر تک تو میں نے اس کی ہمت افزائی کی، اس یقین پر کہ وہ اپنے نظریات کو ایک قدم آگے بڑھائے گا؛ لیکن اس کی نیت یہ کب تھی کہ مشاہدات کرے یا دماغ سے کام لے: اس نے ذہین ترین نوجوانوں کو جنھیں وہ گاؤں میں اور گیبزے میں جانتا تھا گھر مدعو کیا، ان سے کہا کہ انھیں ارفع ترین سائنس کا درس دے گا، باغ میں نظامِ شمسی کا وہ ماڈل کھڑا کر دیا جس لے آنے کے لیے اس نے مجھے استنبول بھیجا تھا، گھنٹیوں کی مرمت کی، تیل دیا، اور ایک شام، اس جوش و خروش اور اس توانائی کے ساتھ جو خدا جانے وہ کہاں سے لے آیا تھا، بڑی سرگرمی سے اس نظریے کو دہرایا، بغیر کوئی غلطی یا بھول چوک کیے، جس کی وہ برسوں پہلے پاشا اور پھر سلطان کے سامنے تشریح کر چکا تھا۔ لیکن اگلی صبح جب ہم نے بھیڑ کا دل اپنے دروازے کے قدمچے پر پڑا پایا، ہنوز گرم اور خون ریزاں، ایک ٹوٹکا اس پر لکھا ہوا، تو یہ آخر کار ان نوجوانوں پر جو آدھی رات کو بغیر ایک سوال کیے گھر سے رخصت ہوئے تھے اور فلکیات پر اس کی تمام تر آس مٹانے کے لیے بہت کافی تھا۔

لیکن اس پسپائی کو اس نے اپنے گلے کا ہار بھی نہیں بننے دیا: ٹھیک ہے یہ وہ نہیں تھے جو زمین اور ستاروں کی گردش کو سمجھ سکیں؛ اس وقت یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اسے سمجھ ہی لیں؛ وہ جس کے واسطے سمجھنا ضروری تھا بس اب آغازِ شباب سے باہر قدم رکھنے والا تھا، اور ہو سکتا ہے کہ اس نے ہماری عدم موجودگی میں ہمیں طلب کیا ہو، ہم صرف چند دمڑیوں کی خاطر جو فصل کٹائی کے بعد ہمیں یہاں ملنے والی تھیں، اپنے موقعے کو ہاتھ سے جانے دے رہے تھے۔ ہم نے اپنے معاملات یکسو کیے، ان میں کے سب سے زیادہ ذہین نظر آنے والے نوجوان کو نگراں ملازم رکھا، اور استنبول مراجعت کی۔

اگلے تین سال ہمارے واسطے بدترین ثابت ہوئے۔ ہر دن، ہر مہینہ، اپنے گزشتہ کی

طرح ہی نکلا، ہر موسم، کسی دوسرے موسم کا جس سے ہم گزرے تھے بیمار کن اور متعذب
اعصاب چربہ: یوں لگتا تھا جیسے ہم ایک سی اشیا کو نہایت تکلیف اور مایوسی سے بار بار ہوتا دیکھ
رہے ہوں، کسی ایسی تباہی کے منتظر جسے ہم کوئی نام دینے سے عاجز ہوں۔ اسے اب بھی کبھی
کبھار محل بلوایا جاتا، جہاں اس سے یہ توقع کی جاتی کہ اپنی بے ضرر تعبیرات پیش کرے، اور
اب بھی اپنے دوستوں کے ساتھ جمعرات کی جمعرات دوپہر کو مسجد کے اطاق الساعۃ میں اکھٹا
ہوتا، اب بھی اپنے شاگردوں سے صبح ملتا اور ان کی مرمت کرتا، سابقہ باقاعدگی کے ساتھ نہ بھی
سہی، اب بھی ان لوگوں کی مزاحمت کرتا جو کبھی کبھار گھر آ کر شادی کی تجویزیں پیش کرتے،
پہلے جیسے قطعی انداز میں نہ بھی سہی، اب بھی اس موسیقی کو سننے پر مجبور ہوتا جو عورتوں کے ساتھ ہم
بستر ہونے کے لیے اسے سنی پڑتی اور جو اب اسے مزید نہیں بھاتی تھی، اب بھی اکثر اوقات
اس نفرت سے اس کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا جو اسے بے وقوفوں سے محسوس ہوتی تھی، اب بھی خود
کو کمرے میں بند کر لیتا، اس بستر پر لیٹ جاتا جو اس نے بچھایا ہوتا، برہمی سے ان مخطوطوں اور
کتابوں کی ورق گردانی کرتا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوتیں اور انتظار کرتا، چھت کو مسلسل
گھنٹوں تکتا رہتا۔

جس بات نے اس کی حالت اور بھی ابتر کر دی وہ کپرولو محمد پاشا کی کامیابیاں تھیں جن
کے بارے میں وہ اپنے مسجد کے اطاق الساعۃ میں جمع ہونے والے دوستوں سے سنتا تھا۔ جب
اس نے مجھے بتایا کہ بیڑے نے اہلِ وَینِس میں بھگدڑ مچا دی تھی، یا کہ تینیدوس اور لمنُوس کے
جزیرے قبضے میں آ گئے ہیں، یا کہ باغی ابازہ حسن پاشا کچل دیا گیا ہے، تو وہ یہ اضافہ کرتا کہ یہ
محض ایسی بچی کھچی کامیابیاں ہیں جو پلک جھپکتے میں گزر جاتی ہیں، ایک اپاہج کی کلبلاہٹ جو جلد
ہی حماقت اور نااہلی کی دلدل میں دفن ہو جانے والا ہے: وہ کسی تباہی کا منتظر نظر آتا جو ان دنوں
کی یکسانیت اور یک رنگی کو بدل دے جنھوں نے ہمیں یوں اور بھی مضمحل کر دیا تھا کہ یہ صرف
ایک دوسرے کو دہرا رہے تھے۔ بدتر یہ کہ چونکہ اب اس کے پاس اس چیز پر جسے وہ بڑی ہٹ
دھرمی سے ''سائنس'' کہتا تھا، ارتکاز کرنے کے لیے نہ صبر تھا نہ اعتماد، اس کے پاس اپنی توجہ

بٹانے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا: وہ کسی نئے خیال کے لیے ہفتہ بھر سے زیادہ اپنا جوش و خروش
قائم نہیں رکھ سکتا تھا، جلد ہی اسے اپنے احمق یاد آئے اور باقی سب کو فراموش کر دیا۔ کیا ان کے
بارے میں جس قدر تفکر اس نے اب تک کیا تھا کافی نہیں تھا؟ کیا وہ اس قابل تھے کہ ان کے
حوالے سے وہ اپنے کو اس قدر ہلکان کرے؟ اس قدر غصہ کرنے کے قابل؟ اور شاید، چونکہ اس
نے حال ہی میں خود میں اور ان میں فرق کرنا سیکھا تھا، اس سائنس کی تفصیلاً چھان بین کرنے کی
اپنے میں طاقت پاتا تھا اور نہ خواہش۔ اس نے، بہرکیف، یہ سوچنا ضرور شروع کر دیا تھا کہ وہ
دوسروں سے مختلف ہے۔

اس کا پہلا تأثر صرف و محض جھنجھلاہٹ کی پیداوار تھا۔ اب، چونکہ وہ کسی موضوع پر بھی
زیادہ دیر تک مرتکز رہنے سے قاصر تھا، اپنا وقت اس لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اور احمق بچے کی
طرح گزارتا جسے اپنا دل بہلانے کی کوئی ترکیب نہ آتی ہو، گھر میں ایک کمرے سے دوسرے
میں چکر لگاتے ہوئے، زینے سے ایک منزل سے دوسری منزل اوپر نیچے آتے جاتے ہوئے،
خالی نظروں سے اِس کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے یا اُس کھڑکی کے۔ اس غیر مختتم اور پاگل
کر دینے والی آ جا کے دوران جب وہ میرے پاس سے گزرتا، جس سے گھر کے چوبی فرش
احتجاجاً کراہنے اور کھڑکھڑانے لگتے، مجھے پتا ہوتا کہ وہ اس بات کا متمنی ہے کہ میں کسی لطیفے سے،
کسی انوکھے خیال یا ہمت افزائی کے کسی کلمے سے اس کی توجہ کو پھرا دوں۔ لیکن، اپنے احساسِ
شکست کے باوجود، وہ غصہ اور تنفر جو میں اس کے لیے محسوس کرتا، ان کی شدت میں کوئی کمی نہیں
آئی تھی، میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس وقت بھی، جب مجھ سے کسی قسم کا جواب اگلوانے کی
خاطر، وہ اپنے گھمنڈ کو پی کر میری سرکشی کا مقابلہ انکساری سے کرتا، چند مہربان لفظوں کے ساتھ،
میں وہ کہنے سے احتراز کرتا جسے سننے کا وہ آرزومند ہوتا؛ جب اس نے اعلان کیا کہ محل سے
اطلاع ملی ہے جس کی خوش گوار تعبیر کی جا سکتی ہے، یا اسے ایک نیا خیال آیا ہے جو اگر وہ اس پر
سر کھپائے اور اس کا تعاقب کرے تو سونے میں تولا جانے کے قابل ہے، میں یا تو اس کی بات
نہ سننے کا رنگ بھرتا یا اس کے بیان میں سب سے پھیکی سیٹھی چیز کو خصوصی طور پر نمایاں کر کے فوراً

اس کے سارے جوش پر پانی ڈال دیتا۔ میں اسے اپنے ذہن کے خلا میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر محظوظ ہوتا۔

لیکن بعد میں ٹھیک اسی ویرانی میں اسے وہ خیال ہاتھ آ گیا جس کی اسے حاجت تھی؛ شاید اس لیے کہ اب وہ خود اپنے رحم و کرم پر تھا، شاید اس لیے کہ اس کا دماغ، نچلا بیٹھنے سے عاجز، اپنے بے لگام اتاولے پن سے امان نہیں پاسکتا تھا۔ ٹھیک اس وقت میں نے اسے جواب دیا— میں اس کی ہمت افزائی کرنا چاہتا تھا— جس سے خود میری دلچسپی جاگ اٹھی؛ شاید جب یہ سب ہو رہا تھا میں نے یہاں تک سوچا کہ وہ میری پروا کرتا ہے۔ ایک شام جب خوجہ کے قدموں کی چرچراہٹ پورے گھر سے گزرتی ہوئی میرے کمرے تک بھی پہنچ گئی اور اس نے کہا، جیسے ادنیٰ ترین سوال کر رہا ہو، ’’میں کیوں وہ ہوں جو ہوں؟‘‘ تو میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور جواب دینے کی کوشش کی۔

میں نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ جو وہ ہے ویسا کیوں ہے، پھر یہ اضافہ کیا کہ یہ سوال ’’وہ‘‘ اکثر پوچھتے ہیں، اور ہر روز بیشتر پوچھتے ہیں۔ جب میں نے یہ کہا تو اس کی تصدیق کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، کوئی خاص نظریہ ذہن میں نہیں تھا، کچھ بھی تو نہیں، صرف یہ خواہش ہی تھی کہ اس کے سوال کا جواب اس کے حسب منشا دوں، شاید اس لیے کہ مجھے جبلی طور پر یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہ اس کھیل سے لطف اندوز ہوگا۔ لیکن اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھا، وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی بات جاری رکھوں؛ جب میں خاموش رہا تو وہ ضبط نہ کرسکا؛ وہ چاہتا تھا کہ جو کہہ چکا ہوں اسے دہراؤں: ہاں، تو وہ یہ سوال کرتے ہیں؟ جب اس نے مجھے اقرار میں مسکراتا دیکھا تو فوراً برافروختہ ہوگیا: وہ یہ اس لیے نہیں پوچھ رہا کیونکہ اس کے خیال میں ’’انھوں نے‘‘ اسے پوچھا تھا، بلکہ اس نے یہ من عندہٖ پوچھا ہے، بغیر یہ جانے ہوئے کہ انھوں نے اسے پوچھا تھا، اس کی بلا سے وہ چاہیں سو کریں۔ پھر، ایک عجیب سے لہجے میں، وہ بولا، ’’یوں لگتا ہے جیسے کوئی آواز اس کے کانوں میں نغمہ سرا ہو۔‘‘ اس پراسرار آواز نے اسے اپنا باپ یاد دلا دیا تھا، اس نے بھی مرنے سے پہلے ایسی ہی آواز سنی تھی، لیکن

اس کا گیت دوسرا تھا۔ ’’میری والی آواز وہی ٹیپ کا مصرع دہراتی رہتی ہے،‘‘ اس نے کہا، اور تھوڑی سی خجالت سے معاً یہ اضافہ کیا، ’’میں جو ہوں وہی ہوں، میں جو ہوں وہی ہوں، آہ!‘‘

میں تقریباً زور سے ہنس پڑا، لیکن اس لہر کو قابو میں رکھا۔ اگر یہ ایک بے ضرر سا مذاق تھا، تو ہنسنا اسے بھی چاہیے تھا؛ وہ ہنس نہیں رہا تھا؛ لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کر لیا کہ مضحکہ خیز نظر آنے کے قریب تھا۔ مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا کہ میں ٹیپ کے مصرعے کی مہملیت اور معنویت دونوں سے آگاہ ہوں؛ کیونکہ اس مرتبہ میں خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جاری رہے۔ میں نے کہا کہ ٹیپ کا مصرع سنجیدگی سے برتے جانے کا مقتضی ہے؛ اس میں کلام نہیں کہ جس نغمہ سرا کو اس نے سنا تھا، وہ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ شاید میری بات میں اسے تضحیک کا شائبہ نظر آیا ہو، کیونکہ وہ تاؤ میں آ گیا: اسے بھی یہ معلوم تھا؛ جس بات نے اسے چکرا دیا تھا وہ یہ تھی کہ آواز یہ ایک ہی فقرہ کیوں بار بار دہرائے جا رہی تھی!

وہ اس قدر مشتعل ہوگیا تھا کہ میں نے، ظاہر ہے، اسے نہیں بتایا، لیکن حقیقت یہ ہے جو میں سوچ رہا تھا وہ یہ تھا: مجھے معلوم تھا، نہ صرف ذاتی تجربے کی بنیاد پر، اپنے بھائی بہنوں کے تجربے کی بنیاد پر بھی، کہ وہ اکتاہٹ جو خودغرض بچے محسوس کرتے ہیں یا باثمر نتائج پیدا کرتی ہے یا محض بکواس۔ میں نے کہا کہ قابلِ غور بات یہ نہیں کہ اس نے ٹیپ کا مصرع کیوں سنا ہے، بلکہ یہ کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ شاید اس وقت یہ خیال بھی مجھے آیا کہ کسی چیز پر اپنی توجہ منعطف نہ کرنے کی وجہ سے کہیں اس کا دماغ نہ چل جائے؛ اور کہ میں اس کا مشاہدہ کر کے خود اپنی مایوسی اور بزدلی کے پیدا کردہ جور و تعدی سے فرار حاصل کرسکتا ہوں۔ پھر یہ بھی کہ، شاید اس دفعہ میں اخلاص سے اس کی عزت کرنے کے قابل ہو جاؤں؛ اگر وہ ایسا کرسکے، تو ہوسکتا ہے کہ کوئی واقعی حقیقی چیز اب ہم دونوں کی زندگیوں میں رونما ہو۔ ’’اچھا تو میں کیا کروں؟‘‘ آخرکار اس نے کمال مجبوری سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ اس پر غور کرے کہ جیسا ہے ویسا کیوں ہے، اور یہ میں اسے کوئی نصیحت نہیں کر رہا ہوں؛ میں اس کی مدد نہیں کرسکتا، یہ تو اسے خود ہی کرنی پڑے گی۔ ’’تو کیا کروں، آئینے میں دیکھوں؟‘‘ اس نے طنزاً کہا۔ لیکن وہ کچھ کم برافروختہ نہیں نظر

آ رہا تھا۔ میں کچھ نہ بولا، تا کہ اسے خود سوچنے کی مہلت دے سکوں۔ ''کیا میں آئینے میں دیکھوں؟'' اس نے دہرایا۔ اچانک مجھے غصہ آ گیا، مجھے لگا کہ خوجہ اپنے طور پر کبھی کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اس بات سے آگہی ہو جائے، میں اس کے روبرو کہنا چاہتا تھا کہ میرے بغیر وہ سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن مجھے ہمت نہ پڑی؛ لاتعلقی کے انداز سے میں نے اس سے کہا کہ ہاں، جائے اور آئینے میں دیکھے۔ نہیں، مجھ میں ہمت کا فقدان نہیں تھا، بس میرا جی نہیں چاہا۔ وہ طیش میں آ گیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا، اور جاتے جاتے چلایا: تم احمق ہو۔

تین دن بعد جب میں نے موضوع کو دوبارہ چھیڑا اور دیکھا کہ وہ ہنوز ''ان کے'' بارے ہی میں بات کرنا چاہتا ہے، تو کھیل جاری رکھنے سے مجھے فرحت ہوئی؛ نتیجہ کچھ بھی نکلے، صرف یہ دیکھنا کہ وہ کسی چیز میں مشغول ہو گیا ہے میری آس بڑھانے کے لیے بہت کافی تھا۔ میں نے کہا ''وہ'' آئینہ ضرور دیکھتے ہیں، اور حقیقت ہے کہ یہاں پر لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کثرت سے۔ نہ صرف بادشاہوں، شہزادوں، اور شرفا کے محل، بلکہ عام آدمیوں کی رہائش گاہیں بھی احتیاط سے فریم شدہ اور دیواروں پر آویزاں آئینوں سے اَٹی پڑی ہوتی ہیں؛ صرف اس لیے نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی اس اعتبار سے پیشرفت کا باعث ان کا اپنے بارے میں مسلسل غور و فکر کرنا ہے۔ ''کس اعتبار سے؟'' اس نے پوچھا، ایسے اشتیاق اور معصومیت سے جس نے مجھے تعجب میں ڈال دیا۔ مجھے لگا کہ وہ میری بات کے بارے میں سنجیدہ ہے، لیکن پھر اس نے دانت نکوسے: ''تو تمھارا مطلب ہے وہ صبح سے رات تک آئینے میں آنکھیں گڑوئے رہتے ہیں!'' پہلی بار وہ میرے ملک کی اور جو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا اس کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ غصے میں آ کر میں کہنے کے لیے کوئی فقرہ ڈھونڈنے لگا جو اسے ٹھیس پہنچا سکے، اور، اچانک، بلا سوچے، بلا اس پر یقین کیے، میں نے اعلان کر دیا کہ صرف وہ خود ہی یہ دریافت کر سکتا ہے کہ وہ کون ہے، لیکن وہ اتنا مرد نہیں کہ اس کی کوشش کرے۔ اس کے چہرے کو اذیت سے مسخ ہوتے دیکھ کر مجھے لطف آیا۔

لیکن اس لطف کی مجھے بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس لیے نہیں کہ اس نے مجھے زہر دینے کی دھمکی دی؛ چند دن بعد، اس نے مطالبہ کیا کہ اس جرأت کا مظاہرہ کروں جس کی میں اس میں کمی کا دعویدار ہوں۔ پہلے تو میں نے اسے ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی؛ ظاہر ہے، نہ غور و فکر سے آدمی یہ دریافت کر سکتا ہے کہ کون ہے اور نہ آئینے میں دیکھ کر؛ یہ میں نے اسے بدمزہ کرنے کی خاطر غصے سے کہا تھا؛ لیکن ایسا لگا جیسے اسے مجھ پر یقین نہیں تھا: اس نے مجھے میری غذا میں تخفیف کرنے کی دھمکی دی، حتیٰ کہ اگر اپنی جرأت کا مظاہرہ نہ کیا تو کمرے میں بند کرنے کی بھی۔ میرے لیے کون ہوں حل کرنا اور پھر اسے قلمبند کرنا ناگزیر ہے؛ وہ اس کا تجزیہ کرے گا، دیکھے گا مجھ میں کتنی جرأت ہے۔

(۵)

اول اول میں نے چند صفحات اپنے بھائی بہنوں، ماں اور نانی کے ساتھ ایمپولی میں ہماری مملوکہ اراضی پر اپنے پرمسرت بچپن کے بارے میں رقم کیے۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے کیوں خاص طور پر ان یادوں کو یہ دریافت کرنے کے لیے کہ میں کیوں وہ ہوں جو ہوں قلمبند کیا؛ ہوسکتا ہے مجھے یہ تحریک اس آرزو کے باعث ہوئی ہو جس کا تعلق اس کھوئی ہوئی زندگی کی مسرت سے ہو؛ اور خوجہ نے میری اس غصے میں کہی ہوئی بات کے بعد مجھ پر اتنا دباؤ ڈالا تھا کہ میں مجبور ہوگیا تھا، جیسا کہ فی الوقت ہوگیا ہوں، کہ تصور میں کوئی ایسی چیز ایجاد کروں جو میرے قاری کے لیے قابلِ یقین ہو اور اس کی تفاصیل کو پر لطف بناؤں۔ شروع میں جو میں نے لکھا خوجہ کو پسند نہیں آیا؛ ایسی باتیں تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے، اس نے کہا؛ اسے شک تھا کہ لوگ آئینے میں تکتے وقت یہی سب سوچتے ہیں، کیونکہ یہ وہ جرأت نہیں ہوسکتی جس کی میرے کہنے کے مطابق اس میں کمی تھی۔ اس کا ردعمل بالکل یہی اس وقت بھی ہوا جب اس نے پڑھا کہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ایلپس میں ایک شکاری مہم کے دوران میں اچانک کیسے ایک ریچھ کے روبرو آ گیا تھا، کیسے ہم بڑی دیر تک ایک دوسرے کو کھڑے گھورتے رہے تھے، یا اپنے محبوب کو جوان کو بسترِ مرگ پر دیکھ کر میرے کیا محسوسات تھے جو ہماری نظروں کے سامنے خود

اپنے ہی گھوڑوں کے پیروں تلے کچلا گیا تھا: ایسی باتیں تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔

اس پر میں نے جواب دیا کہ وہاں لوگ اس سے زیادہ نہیں کرتے تھے، جو میں نے پہلے کہا وہ مبالغہ آمیز تھا، میں غصے میں جو تھا، اور خوجہ اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے نہ کرے۔ لیکن وہ سن کہاں رہا تھا؛ کمرے میں بند کردیے جانے کے خیال سے مجھے خوف آتا، سو میں جو پیکر ذہن میں آئے لکھتا چلا گیا۔ اس طرح میں نے دو ماہ کبھی دکھ سے اور کبھی خوشی سے اس قسم کی بہت سی یادوں کے احیا اور بازخوانی میں گزارے جو زیادہ تر غیر اہم تھیں لیکن یاد کرنے میں خوشگوار۔ غلام بنائے جانے سے پہلے کے اچھے اور برے تجربات جو مجھے پیش آئے تھے انھیں تصور میں جگایا اور دہرایا، اور آخر میں محسوس کیا کہ اس مشق سے مجھے مزہ آرہا ہو۔ اب خوجہ کو مجھے لکھنے پر مجبور کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی؛ جب بھی وہ کہتا کہ اسے اطمینان نہیں ہوا، میں کسی دوسری یاد کی طرف چل پڑتا، کسی دوسری کہانی کی طرف جس لکھنے کا انتخاب میں نے پیشگی کرلیا ہوتا۔

بہت بعد میں، جب میں نے دیکھا کہ خوجہ میرے لکھے ہوے سے بھی لطف لیتا ہے، میں اسے اس کارروائی میں لگانے کا موقع تلاش کرنے لگا۔ زمین ہموار کرنے کے لیے میں نے بچپن کے چند تجربات کا ذکر کیا جو مجھے پیش آئے تھے: میں نے اس سے ایک غیر مختتم، بے خواب رات کی دہشت کا ذکر کیا جو میرے قریب ترین دوست کی وفات کے بعد آئی تھی، وہ دوست جس کے ساتھ مجھے ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی، مجھے کتنا ڈر لگا تھا کہ مجھے مردہ تصور کرلیا جائے گا اور اس کے ساتھ زندہ دفن کردیا جائے گا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اس پر فریفتہ ہوجائے گا! جلد ہی میں نے اس سے اپنا ایک خواب بیان کرنے کی جرأت بھی کرڈالی: میرا جسم مجھ سے جدا ہوگیا ہے، میرے ایک ہم شکل سے جوڑ دیا گیا ہے جس کا چہرا سایوں میں پوشیدہ ہے، اور وہ دونوں مل کر میرے خلاف سازش کررہے ہیں۔ اس وقت خوجہ کہہ رہا تھا کہ وہی مضحکہ خیز ٹیپ کا مصرع اسے دوبارہ اور زیادہ شدت سے سنائی دے رہا ہے۔ جب میں نے دیکھا، جیسا کہ میری آرزو تھی، کہ خواب نے اسے متأثر کیا

ہے، میں نے اصرا کیا کہ اس قسم کی نگارش ایسی چیز ہے جو اسے بھی آزمانی چاہیے۔ یہ اس لامتناہی اور آرزومندانہ انتظار سے اس کی توجہ پھیر سکے گی، اور وہ اس چیز کو دریافت کر سکے گا جو اسے اپنے احمقوں سے جدا کرتی ہے۔ گاہے گاہے اسے محل بلایا جاتا، لیکن وہاں امید افزا پیشرفت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے مزاحمت کی، لیکن جب میں نے دباؤ ڈالا، تو متجسس ہوا، منفعل اور اتنا اکتایا ہوا کہ بولا کوشش کرے گا۔ اسے اپنے مضحکہ خیز نظر آنے کا خوف تھا اور، یہاں تک کہ مجھ سے پوچھا: جیسے ہم ساتھ ساتھ لکھا کرتے تھے، اس طرح ساتھ ساتھ آئینے میں خود کو دیکھیں گے بھی؟

جب اس نے کہا اس کی خواہش ہے ہم ساتھ ساتھ بیٹھ کر لکھیں، مجھے گمان بھی نہ ہوا کہ اس کا منشا بھی ٹھیک یہی ہے کہ میز پر ساتھ ساتھ بیٹھیں۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ جب وہ لکھنا شروع کرے گا، مجھے ایک کاہل الوجود غلام کی فارغ البالی واپس مل جائے گی۔ میں غلطی پر تھا۔ اس نے کہا کہ ہم دونوں میز کے انتہائی سروں پر آمنے سامنے بیٹھ کر لکھیں: ہمارے ذہن، ان خطرناک موضوعات کا سامنے کرنے کے دوران بھٹکیں گے، فرار حاصل کرنے کی جستجو کریں گے، اور صرف اسے طرح ہم راہ پر گامزن ہو سکیں گے، صرف اسی طرح ہم نظم و ضبط کی روح سے ایک دوسرے کو مستحکم کر سکیں گے۔ لیکن یہ سب بہانے تھے؛ مجھے معلوم تھا کہ وہ اکیلے رہ جانے سے خوفزدہ ہے، غور و فکر کرتے وقت اپنی تنہائی کو محسوس کرنے سے ہراساں ہے۔ میرے واسطے اس بات کی توثیق اس طرح بھی ہو گئی کہ خالی صفحے کا سامنا کرتے وقت وہ بڑبڑانے لگتا، جو صرف اتنی بلند ہوتی کہ میں سن سکوں؛ وہ اس کا منتظر ہوتا کہ جو لکھنے والا ہے اس پر پہلے میری صوابدید حاصل کر لے۔ چند جملے گھسیٹنے کے بعد، وہ مجھے ایک بچے کی معصوم انکساری اور اشتیاق سے دکھاتا: کیا یہ چیزیں لکھی جانے کے لائق ہیں، وہ حیرانی سے سوچتا؟ ظاہر ہے، میں اپنی منظوری دے دیتا۔

اس طرح دو مہینوں کے اندر اندر میں نے اس کی زندگی کے بارے میں گزشتہ گیارہ سالوں سے زیادہ جان لیا۔ اس کا خاندان اَیدرنہ میں رہتا تھا، وہ شہر جس کی ہم نے بعد میں حاکم

کے ساتھ زیارت کی۔ اس کا باپ کم عمری ہی میں مر گیا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا چہرہ بھی یاد ہو۔ اس کی ماں ایک محنت کش عورت تھی۔ اس نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ پہلے شوہر سے اس کے دو بچے پیدا ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ دوسرے شوہر سے چار بیٹے۔ یہ شخص ایک رضائی بنانے والا تھا۔ بچوں میں پڑھنے لکھنے کی طرف سب سے زیادہ مائل ظاہر ہے وہی تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین، ہوشیار، محنتی، اور طاقتور بھی وہی تھا؛ اور سب سے زیادہ ایماندار بھی۔ وہ ان سبھوں کو نفرت کے ساتھ یاد کرتا، سوائے اپنی بہن کے، لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ یہ سب تحریر میں لانے کے قابل باتیں ہیں۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، شاید اس لیے کہ مجھے اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ آگے چل کر میں اس کا انداز اور اس کی زندگی کی حکایت کو اپنانے والا ہوں۔ اس کی زبان اور اس کی ذہنی ساخت میں کوئی چیز تھی جو مجھے بڑی دل آویز لگتی اور میں خود اس میں مہارت حاصل کرنا چاہتا۔ آدمی کو چاہیے کہ اس زندگی سے جو اس نے منتخب کی ہے اتنی محبت ضرور کرے کہ اختتام پر اسے اپنا کہہ سکے؛ اور میں اپنی زندگی سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں۔ ظاہر ہے، وہ اپنے سارے بھائیوں کو بے وقوف سمجھتا تھا؛ وہ صرف اس سے پیسے اینٹھنے کی خاطر ہی اسے ڈھونڈ نکالتے تھے؛ جبکہ اس نے خود کو مطالعے کے واسطے وقف کر دیا تھا۔ سلیمیہ مدرسے میں قبول کیے جانے کے بعد جب وہ فارغ التحصیل ہونے ہی والا تھا اس پر ایک جھوٹا الزام لگ گیا۔ اس نے اس واقعے کا دوبارہ کبھی ذکر نہیں کیا، نہ کبھی عورتوں کا۔ بالکل آغاز میں اس نے رقم کیا کہ ایک موقعے پر وہ شادی کرنے کے بالکل قریب آ گیا تھا، پھر مارے غصے کے اس نے جو کچھ تحریر کیا تھا اسے پھاڑ ڈالا۔ اس رات ایک بڑی غلیظ سی بارش ہو رہی تھی۔ یہ بہت سی ہیبت ناک راتوں میں کی پہلی رات تھی جنھیں میں بعد میں جھیلنے والا تھا۔ اس نے میری بے عزتی کی، کہا کہ جو اس نے لکھا ہے سب جھوٹ ہے، اور دوبارہ شروع ہو گیا؛ اور چونکہ اس کا فرمان تھا کہ میں بھی روبرو بیٹھ کر لکھوں، مجھے دو دن بنا سوئے گزارنے پڑے۔ میں جو لکھتا اس پر اب وہ کوئی توجہ نہ دیتا؛ میں میز پر اپنے سرے پر بیٹھا رہتا، جو لکھا ہوتا اس کی نقل بناتا، اپنے تخیل سے کوئی

کام لیے بغیر، اور اپنی آنکھ کے گوشے سے اسے دیکھتا رہتا۔

چند دن بعد، اس قیمتی، صاف سفید مشرق سے درآمدہ کاغذ پر، اس نے سرخی لگائی ''میں کیوں وہ ہوں جو ہوں،'' لیکن اس عنوان کے تحت، ہر صبح، اس نے اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ''وہ'' اتنے کہتر اور احمق تھے۔ تاہم، مجھے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ ماں کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا، اپنے ورثے سے جس قدر پیسہ بازیاب کرسکا اسے لے کر استنبول چلا آیا، درویشوں کی ایک اقامت گاہ میں چند دن قیام کیا لیکن یہ فیصلہ کر کے کہ وہاں کے سارے لوگ سفلے اور جعلی تھے اسے چھوڑ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ درویش گھر میں جو تجربات اسے پیش آئے تھے ان کے بارے میں کچھ اور معلوم کروں؛ میرا خیال تھا کہ ان سے علاحدگی اس کے واسطے حقیقی کامیابی ثابت ہوئی تھی: وہ اپنے کو ان سے جدا دیکھنے پر قادر ہوا تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر کیا تو وہ غصے میں آ گیا، بولا کہ میں اس سے گھنونی باتیں سننا چاہتا ہوں تا کہ ایک روز انھیں اس کے خلاف استعمال کرسکوں؛ بہرکیف میں پہلے ہی اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں، مستزاد یہ کہ اسے شک ہورہا ہے کہ میں اب وہ تفصیلات بھی جاننا چاہتا ہوں —— یہاں اس نے ایک ویسا جنسی فقرہ کہا جو ناشائستہ خیال کیے جاتے ہیں۔ پھر وہ بڑی دیر تک اپنی بہن سیمرا کے بارے میں گفتگو کرتا رہا، کہ وہ کتنی پاکباز تھی اور اس کا شوہر کتنا بدمعاش؛ اس نے اتنے سالوں تک اسے نہ دیکھنے پر تأسف کا اظہار کیا، لیکن جب میں نے اس میں اپنی دلچسپی ظاہر کی تو ایک بار پھر شک وشبہ کرنے لگا، اور کسی دوسرے ہی موضوع کی طرف گریز کیا: تو جب اس نے پلّو میں جس قدر پیسے تھے کتابوں پر خرچ کردیے، تو اس کے بعد سوائے ایک مدتِ مدید تک انھیں پڑھنے کے اس نے کچھ اور نہیں کیا، بعد میں جہاں تہاں منشی گیری کی —— لیکن لوگ اتنے بے حیا تھے —— اور پھر اسے صادق پاشا کا خیال آیا، جس کی موت کی خبر ابھی ابھی ارزنجان سے آئی تھی۔ انھیں دنوں میں خوجہ کی اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، اور فوراً ہی سائنس سے اپنی محبت کے باعث اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ یہ پاشا ہی تھا جس نے خوجہ کو ابتدائی اسکول میں پڑھانے کی نوکری دلوائی تھی، لیکن وہ ایک اور احمق تھا۔ لکھنے

کے اس دورے کے اختتام پر، جو مہینہ بھر قائم رہا، ایک رات، نادم ہوکر، اس نے سارے لکھے کو تار تار کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ، اس کی جلد بازی میں گھسیٹی ہوئی تحریروں اور خود اپنے تجربات کو بارِ دگر متشکل کرتے ہوے، جس میں صرف اپنے تخیل پر اعتماد کرتا ہوں، مجھے ان تفاصیل سے، جن میں مجھے اس قدر کشش نظر آتی ہے، اور زیادہ مغلوب ہوجانے سے خوف نہیں آتا۔ جوش کے ایک آخری طرارے میں اس نے چند صفحات لکھے جنھیں ''احمق جن سے میں کما حقہ واقف تھا'' کے تحت منضبط کیا گیا تھا، لیکن پھر بھڑک اٹھا: یہ سب لکھنا لکھانا، اس سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ہے؛ اس نے کوئی نئی بات نہیں سیکھی ہے، اور اسے ابھی تک نہیں معلوم کہ وہ جیسا ہے ویسا کیوں ہے۔ میں نے اسے فریب دیا ہے، میں نے اسے خواہ مخواہ ان باتوں کو سوچنے پر لگایا ہے جنھیں وہ نہیں چاہتا کہ یاد کرے۔ وہ مجھے سزا دینے والا ہے۔

معلوم نہیں سزا دینے کا یہ خیال، جو ہمارے باہم گزارے ہوے اولین دنوں کی یاد تازہ کردیتا، کیوں اس قدر اس پر حاوی ہوگیا تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ یہ میری بزدلانہ اطاعت گزاری ہے جس نے اسے بیباک کردیا ہے۔ لیکن جس لمحے اس نے سزا کی بات کی، میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرڈالا۔ جب خوجہ ماضی کے بارے میں لکھنے سے پوری طرح اکتا گیا، تو کچھ دیر تک گھر میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جب وہ دوبارہ میرے پاس آیا تو بولا کہ ہمیں چاہیے فی نفسہٖ خیال ہی کو لکھیں: جیسے آدمی اپنے حلیے کو آئینے میں دیکھ سکتا ہے، اپنے جوہر کی خود اپنے خیالات میں جانچ پڑتال کرسکتا ہے۔

تمثیل کے چمکیلے تناسب نے مجھے بھی جوش دلا دیا۔ ہم فوراً میز پر آ بیٹھے۔ اس مرتبہ میں نے بھی، گو نیم طنزیہ طور پر، ''میں جو ہوں کیوں ہوں'' صفحے کے بالکل اوپر نقش کردیا۔ فوراً ہی، چونکہ بات ذہن میں اس چیز کی طرح آئی جو میری ذات کا تشخّص کرتی ہو، میں نے اپنی کم آمیزی سے متعلق بچپن کی یاد کو تحریر میں لانا شروع کیا۔ پھر، جب میں نے وہ پڑھا جو خوجہ دوسروں کی خباثت کے بارے میں لکھ رہا تھا، مجھے ایک خیال آیا جو اس وقت اہم معلوم ہوا، اور میں نے کہدیا۔ خوجہ کو اپنے معائب کی بابت بھی لکھنا چاہیے۔ میں نے جو لکھا تھا اسے پڑھنے

کے بعد، اس نے اصرار کیا کہ وہ بزدل نہیں ہے۔ میں نے یہ استدلال پیش کیا کہ اگرچہ وہ بزدل نہیں، دوسروں ہی کی طرح اس کے منفی پہلو بھی ہیں، اور اگر وہ ان کی تہہ میں جائے تو اپنی حقیقی ذات کو پا سکتا ہے۔ میں یہ کر چکا تھا، اور وہ مجھ جیسا ہونا چاہتا ہے؛ یہ مجھے اس میں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے جب یہ کہا تو دیکھا کہ وہ برہم ہونے لگا ہے، لیکن اس نے خود پر قابو پالیا، ہوشمندی برتنے کی کوشش کی، بولا کہ یہ دوسرے ہیں جو مذموم ہیں؛ یقیناً، ہر کوئی نہیں، لیکن چونکہ زیادہ تر لوگ نامکمل اور منفی ہیں، اسی لیے دنیا میں ہر چیز غلط ہو رہی ہے۔ اس پر میں نے اختلاف کیا، یہ کہہ کر کہ خود اس میں بہت کچھ خباثت ہے، حتیٰ کہ کراہت انگیز، اور اسے یہ پہچاننا چاہیے۔ میں نے بے باکی سے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ وہ مجھ سے بدتر ہے۔

اس طرح شر کے ان مہمل اور ہیبت ناک دنوں کی ابتدا ہوئی! وہ مجھے میری میز کے پاس کرسی سے باندھ دیتا اور میرے روبرو بیٹھ جاتا، جو جی میں آتا لکھوانے کا حکم دیتا، لیکن کیا لکھوانا چاہتا ہے اس کا اسے اب علم نہیں تھا۔ اس تمثیل کے علاوہ اس کے دماغ میں کوئی اور چیز نہیں تھی: جیسے ایک شخص آئینے میں اپنی ظاہری شکل دیکھ سکتا ہے، اس طرح وہ اپنے خیالات میں اپنے اندرونِ دماغ کا مشاہدہ بھی کر سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اس کی ترکیب معلوم ہے لیکن اس پر منکشف کرنے سے محترز ہوں۔ جب خوجہ میرے سامنے بیٹھتا، اس انتظار میں کہ میں اس کا راز رقم کروں، میں صفحے کے صفحے خود اپنے معائب کی مبالغہ آمیز کہانیوں سے سیاہ کر دیتا: میں نے مزے لے لے کر اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی چوریوں کے بارے میں لکھا، حاسدانہ جھوٹ، وہ سازشیں جو میں اپنے کو تمام بھائی بہنوں سے زیادہ محبوب بنانے کے لیے کرتا، اپنی جوانی کی جنسی لغزشیں، اور جوں جوں بیان میں آگے بڑھتا گیا، سچ کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیا۔ جس حریصانہ تجسس سے خوجہ نے ان کہانیوں کو پڑھا، ان سے عجیب لذت اٹھائی، اس پر مجھے دھچکا سا لگا؛ بعد میں وہ اور زیادہ غصے میں آجاتا، اپنے ظالم برتاؤ میں زیادتی کرتا جو پہلے ہی ساری حدود سے آگے نکل چکا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ ایک ایسے ماضی کے گناہوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جس کے بارے میں اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے اپنانے والا ہے۔

اب وہ مجھے برملا زدوکوب کرنے لگا۔ میری کسی زیادتی کی بابت پڑھنے کے بعد، وہ چلاتا، ''بدمعاش!'' اور میری کمر پر ایک مکّا رسید کر دیتا جس کی شدت نصف ہی مذاقاً ہوتی؛ ایک دو بار، بے قابو ہو کر، اس نے میرے منہ پر تھپڑ بھی مارا۔ اس طرزِ عمل کا سبب یہ رہا ہو کہ اب اسے محل سے کم سے کم بلاوا آتا، یا یہ رہا ہو کہ اس نے خود کو یقین دے لیا تھا کہ اپنی توجہ بٹانے کے لیے اب ہم دونوں کے سوا اسے کوئی اور چیز نہیں ملے گی، شاید یہ محض مایوسی کے باعث ہو۔ لیکن جتنا زیادہ اس نے میری معصیتوں کے بارے میں پڑھا اور اپنی گھٹیا، بچکانی عقوبتوں میں اضافہ کیا، اتنا ہی زیادہ میں سلامتی کے ایک مخصوص احساس میں لپٹتا چلا گیا: پہلی بار میں یہ سوچنے لگا کہ وہ اب میری مٹھی میں آ گیا ہے۔

ایک بار، جب مجھے بڑی بری طرح مجروح کر چکا، تو میں نے دیکھا کہ اسے مجھ پر رحم آ رہا ہے، لیکن یہ ایک مہلک جذبہ تھا جس میں اس کراہت کی چھوٹ بھی پڑ رہی تھی جو آدمی کسی ایسے کے لیے محسوس کرتا ہے جسے وہ کسی اعتبار سے بھی اپنا ہمسر نہ سمجھتا ہو: مجھے یہ اس انداز میں بھی محسوس ہوئی جب وہ آخرکار مجھے بغیر کسی تنفر کے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ ''چلو اب اور نہ لکھیں،'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم اب مزید لکھو۔'' پھر اس نے اپنی تصحیح کی، کیونکہ ہفتوں گزر گئے تھے جن میں وہ مجھے اپنی خامیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے محض دیکھتا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں یہ گھر، جو دن بدن افسردگی میں ڈوبتا جا رہا ہے، چھوڑ دینا چاہیے، کوئی تفریحی سفر کرنا چاہیے، شاید گیبزے کا۔ وہ ایک بار پھر فلکیات سے متعلق اپنے کام کی طرف منعطف ہونے والا ہے، اور وہ چیونٹیوں کے طرزِ عمل پر ایک اور بلا کم و کاست مقالہ رقم کرنے کا سوچ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے نزدیک میری ساری عزت کھو جانے کے قریب ہے میرے کان کھڑے ہو گئے، چنانچہ اس کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے میں نے ایک اور کہانی گھڑی جو میری بدمعاشی کو سخت ناخوشگوار روشنی میں پیش کرنے والی تھی۔ خوجہ نے اسے مزے لے لے کر پڑھا اور ذرا بھی غصہ نہ ہوا؛ مجھے محسوس ہوا کہ اسے محض اس بات سے دلچسپی ہے کہ میں اتنا پرلے درجے کا شر پسند آدمی ہونا آخر کس طرح گوارا کر سکا ہوں۔ اور شاید، یہ بھی کہ اتنی رذالت کو

دیکھتے ہوے، وہ مزید میری نقالی نہیں کرنا چاہتا، آخر تک جو ہے وہی رہنے پر قانع ہے۔ یقیناً، اسے معلوم تھا کہ اس میں کسی نہ کسی کھیل کا عنصر موجود تھا۔ اس دن میں نے محل کے کسی چاپلوس کی طرح گفتگو کی جو جانتا ہے کہ اس کا حقیقی مردوں میں شمار نہیں ہوتا؛ میں نے اس کے تجسس کو اور زیادہ ابھارنے کی کوشش کی: اس کا کیا بگڑے گا اگر، گیبز ے جانے سے قبل، وہ ایک آخری کوشش اور کر ڈالے — یہ جاننے کے لیے میں جیسا ہوں ویسا کیسے ہوسکتا ہوں — کہ خود اپنے نقائص کے بارے میں لکھے؟ ضروری نہیں جو وہ لکھے وہ برحق بھی ہو، اور نہ کسی کا اس پر یقین کرنا ہی ضروری ہے۔ اگر وہ یہ کرے تو میں اور مجھ جیسے اس کی سمجھ میں آسکتے ہیں، اور ایک روز یہ علم اس کے لیے کارآمد ثابت ہوگا! انجام کار، اپنے تجسس اور میری بڑبڑاہٹ کی تاب نہ لاکر، اس نے کہا کہ وہ روزِ آئندہ اس کی کوشش کرے گا۔ بیشک، وہ یہ اضافہ کرنا نہیں بھولا کہ وہ یہ صرف اس لیے کرے گا کہ خود یہ کرنا چاہتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ میرے احمقانہ کھیل کے دام میں آ گیا ہے۔

اگلا دن، غلامی میں گزارے ہوے میرے سارے دنوں سے زیادہ فرحت بخش ثابت ہوا۔ اگرچہ اس نے مجھے کرسی کے ساتھ نہیں باندھا، میں نے سار دن اس کے روبرو بیٹھے گزارا تا کہ اسے کوئی اور آدمی بنتے ہوے دیکھنے کا لطف اٹھا سکوں۔ وہ جو کر رہا تھا شروع میں اس پر اتنی شدت سے یقین کیا کہ صفحے کے اوپر اسے اپنے اس احمقانہ عنوان کے ڈالنے کی پروا بھی نہیں رہی، ''میں جو ہوں، کیوں ہوں۔'' اس میں ایک شرارتی بچے کے اعتماد کی ادا تھی جو کسی پرفریب دروغ کا متلاشی ہو؛ میں ایک نظر ہی میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہنوز اپنے کنجِ عافیت میں محصور ہے۔ لیکن مأمونیت کا یہ پھولا ہوا احساس زیادہ دیر قائم نہیں رہا؛ نہ ہی پشیمانی کا وہ سوانگ جو اس نے میری خاطر بھرا تھا۔ جلد ہی اس کی دکھاوے کی حقارت تشویش میں بدل گئی، کھیل سچ مچ کا ہوگیا؛ اس خود الزامی پر عمل پیرا ہونے سے، ہرچند کہ یہ خالی خولی ہی تھی، وہ متحیر اور خوفزدہ ہوگیا۔ جو کچھ تحریر کیا تھا، مجھے دکھائے بغیر، فوراً قلم زد کر دیا۔ لیکن اس کے تجسس میں خیزش آ چکی تھی، اور مجھے گمان ہوا کہ وہ میرے سامنے خود کو شرمسار محسوس کر رہا ہے، کیونکہ اس نے یہ عمل جاری رہنے

دیا۔ تاہم اگر اس نے اپنی اولین تحریک کا تعاقب کیا ہوتا اور میز سے فوراً اٹھ گیا ہوتا، تو شاید اپنا ذہنی سکون برہم نہ ہونے دیتا۔

اگلی چند ساعتوں کے دوران میں نے اس کا اپنی کشمکش سے آہستہ آہستہ باہر نکلنے کا منظر دیکھا: وہ کچھ لکھتا جس میں اپنے بارے میں نکتہ چینی ہوتی اور مجھے دکھائے بغیر پھاڑ دیتا، اور ہر مرتبہ اپنی خود اعتمادی اور توقیرِ نفس کچھ اور کھو دیتا، لیکن پھر وہ دوبارہ لکھنا شروع کرتا، اس امید میں کہ جو ہاتھ سے جاتا رہا ہے اس کی بازیافت ہوسکے۔ بظاہر وہ اپنے اعترافات مجھے دکھانے والا تھا؛ رات آتے تک میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں دیکھا تھا جنھیں پڑھنے کو میں بے قرار تھا، اس نے سب پھاڑ ڈالے تھے اور پھینک دیے، اور اس کی طاقت بھی صرف ہوچکی تھی۔ جب وہ مجھے سب وشتم کرنے لگا، یہ کہہ کر کہ یہ سب ایک قابلِ نفرین کافر کی بازی گری ہے، اس کی خود اعتمادی اس قدر پست ہوچکی تھی کہ میں نے شوخ چشمی سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تأسف محسوس نہ کرنے کا، شرانگیز آدمی ہونے کا عادی ہوجائے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر سے باہر چلا گیا، شاید اس لیے کہ اپنا مشاہدہ کروانے کی تاب نہیں رہی تھی، اور جب وہ دیر سے لوٹا تو اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی عطریات کی مہک سے میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کو وہ، جیسا کہ میرا گمان تھا، طوائفوں کے یہاں گیا تھا۔

اگلی دوپہر، خوجہ کو کام جاری رکھنے کی تحریک دلانے کے لیے، میں نے کہا کو وہ یقیناً اتنا مضبوط ضرور ہے کہ اس قسم کے بے ضرر کھیلوں سے منفی اثر نہ لے۔ بنابریں، یہ ہم کچھ سیکھنے کے لیے ہی کھیل رہے ہیں، محض وقت گزاری کے لیے نہیں، اور انتہائے کار وہ یہ جان سکے گا کہ جنھیں وہ احمق کہتا ہے، کیوں ایسے ہیں۔ کیا ایک دوسرے کو واقعی جان لینے کی توقع کافی پرکشش نہیں؟ آدمی جتنا کسی ڈراؤنے خواب سے سحرزدہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ کسی غیر کو اس کی روح کی ادنیٰ ترین باتوں کا علم ہے۔

یہ وہ نہیں تھا جو میں نے کہا تھا، جسے اس نے بس اتنی ہی سنجیدگی سے برتا جس سے وہ محل کے کسی بونے کی خوشامد کو برتتا تھا، بلکہ روزِ روشن کا اجالا تھا جس نے اسے دوبارہ میز کے

آگے بیٹھ جانے کی تحریک دلائی۔ جب اس شام وہ میز سے اٹھا، اس کا خود پر اعتماد گزشتہ دن سے بھی کم ہوگیا تھا۔ اس رات جب میں نے اسے پھر طوائفوں کے طرف جاتے دیکھا تو اس کی حالت پر رحم آیا۔

القصہ، وہ ہر صبح میز کے پاس جا بیٹھتا، اس یقین کے ساتھ کہ اُس دن جن بدیوں کے بارے میں لکھنے والا ہے، ان کے ماورا جانے کا اہل ہے، اور اس امید میں کہ جو کل کھویا ہے آج دوبارہ پالے گا، پھر ہر شام اٹھ کھڑا ہوتا، اپنی رہی سہی خود اعتمادی کا کچھ حصہ میز پر چھوڑ کر۔ اب چونکہ وہ خود کو نا قابلِ لحاظ پانے لگا تھا، مزید مجھے نا قابلِ لحاظ نہیں سمجھ سکتا تھا؛ مجھے لگا کہ آخر کار اس مساوات کی میرے لیے تھوڑی بہت تصدیق ہوگئی ہے جو ہماری باہم زندگی کے اولین دنوں میں میں نے غلطی سے ہمارے درمیان فرض کرلی تھی؛ اس سے مجھے بڑی فرحت ہوئی۔ چونکہ وہ مجھ سے محتاط رہتا، بولا کہ میرے لیے اس کے ساتھ میز پر بیٹھنا ضروری نہیں؛ یہ بھی اچھی علامت تھی، لیکن میرے غصے نے، جو برسوں سے قوت ضرب جمع کرتا رہا تھا، فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کر ڈالا، میں انتقام لینا چاہتا تھا، حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی کی طرح، میں بھی اپنا توازن کھو چکا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر خوجہ کو اس کی ذات کے بارے میں کچھ اور شک میں مبتلا کردوں، اگر اس کے نوشتہ اعترافات میں سے چند ہی پڑھ لوں، جنھیں وہ مجھ سے بڑی احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھے ہوے ہے، اور لطیف انداز میں اسے خفیف کروں، تو گھر کا غلام اور عاصی وہ ہوگا، میں نہیں۔ اور بہرکیف اس کی علامتیں پہلے ہی سے موجود تھیں: میں دیکھ سکتا تھا کہ اسے جب تب یہ جاننے کی ضرورت رہتی کہ میں اس کا استہزا کر رہا ہوں یا نہیں۔ اسے مزید خود پر یقین نہیں رہا تھا، چنانچہ میری رضامندی کا جویا تھا۔ اب وہ روزمرہ کی ادنیٰ سے ادنیٰ باتوں کے متعلق میری رائے زیادہ سے زیادہ دریافت کرنے لگا تھا: کیا اس کا لباس موزوں ہے، وہ جواب جو اس نے کسی کو دیا تھا ٹھیک ٹھاک ہے، کیا مجھے اس کا خط پسند ہے، میں کیا سوچ رہا ہوں؟ یہ نہ چاہتے ہوے کہ وہ بالکلیہ مایوس ہوجائے اور کھیل کو بیچ ہی میں چھوڑ دے، میں بعض اوقات خود اپنی تنقید کرتا تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے۔ وہ مجھے اسی نظر سے دیکھتا جیسے مجھے

''بدمعاش'' کہہ رہا ہو، لیکن اب مجھے مزید زدوکوب نہیں کرتا تھا؛ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ خود کو بھی قابلِ زدوکوب سمجھنے لگا ہے۔

میں ان اعترافات کے بارے میں سخت متجسس تھا جنھوں نے اس میں اس قدر خود تنفری پیدا کردی تھی۔ چونکہ میں اس کے ساتھ ایک کم تر کا برتاؤ کرنے کا عادی تھا، پوشیدہ طور پر ہی سہی، میرا خیال تھا یہ اعترافات چھوٹی موٹی بے اہمیت معصیتوں کے بارے میں ہوں گے۔ اب جبکہ میں اپنے ماضی کی حقیقت آفرینی کرتا ہوں، اور اپنے سے کہتا ہوں کہ ان اعترافات میں کے ایک دو کو تفصیل کے ساتھ تصور میں لاؤں جن کا ایک جملہ تک میں نے نہیں پڑھا تھا، مجھے ایک بھی ایسا گناہ نہیں ملتا جس کا خوجہ مرتکب ہوا ہو جو میرے قصے کے ربط و استواری اور اس زندگی کو جو میں نے اپنے لیے تصور کی ہے تباہ کر سکے۔ لیکن میرا گمان ہے کہ میری سی حالت والا کوئی شخص اپنے پر از سرِ نو بھروسا کرنا سیکھ سکتا ہے: مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ میں نے خوجہ کو اس قابل کیا کہ وہ ایک دریافت کر سکے بغیر اس کا احساس کیے ہوے، یہی کہ میں نے خود اپنی اور اپنے جیسے دوسروں کی خامیوں کو اس پر عیاں کیا ہے، مکملاً اور قطعاً نہ بھی سہی۔ میں نے غالبًا یہ خیال کیا کہ وہ دن دور نہیں جب میں اسے اور دوسروں کو بتا سکوں گا کہ ان کے بارے میں میری کیا رائے ہے؛ میں انھیں ان کی خباثت کا ثبوت مہیا کر کے تباہ کردوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری کہانی کے قارئین کو یہ احساس ہوگیا ہوگا کہ میں نے بھی خوجہ سے اتنا ہی سیکھا تھا جتنا اس نے مجھ سے! ہوسکتا ہے میں اب اس طرح صرف محسوس ہی کرتا ہوں کیونکہ جب ہماری عمر بڑھ جاتی ہے، ہم سبھی زیادہ تناسب کی جستجو کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ان قصوں میں بھی جو پڑھتے ہیں۔ ہونہ ہو میں ایک ناراضگی کے مارے، جو برسہا برس سے طاقت اکٹھا کر رہی تھی، ابل پڑا ہوں۔ جب خوجہ نے پیٹ بھر کے اپنی خفت کروالی ہوگی، میں اس سے اپنے برتری قبول کرواؤں گا، یا کم از کم اپنی خودمختاری، اور پھر استہزا کے ساتھ اپنی آزادی کا مطالبہ کروں گا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے آزاد کردے گا، حتیٰ کہ اس پر جھینکے گا بھی نہیں، سوچ رہا تھا کہ وطن لوٹنے پر ترکوں کے درمیان اپنی جوکھوں بھری مہم جوئیوں پر کتابیں لکھوں گا۔ تناسب کا جملہ

احساس کھو دینا میرے لیے کتنا آسان تھا! ایک صبح جو خبر وہ لایا اس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ شہر میں طاعون پھیل گیا تھا! چونکہ اس نے اس کا ذکر کچھ اس طرح کیا جیسے کسی اور ہی، دور افتادہ، جگہ کی بات کر رہا ہو، استنبول کی نہیں، پہلے میں نے اس پر یقین نہیں کیا؛ میں نے پوچھا کہ اسے یہ خبر کیسے ملی، میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اچانک اموات کی تعداد بغیر کسی وجہ کے بڑھتی جا رہی تھی، شاید کسی بیماری کے باعث۔ میں نے پوچھا کہ بیماری کی کیا علامتیں ہیں ــــ شاید طاعون نہ رہا ہو۔ خوجہ مجھ پر ہنس پڑا: مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے، اگر مجھے یہ آ لگی تو بغیر کسی شک و شبہے کے جان لوں گا، جان لینے کے لیے آدمی کے پاس بخار کے صرف تین ہی دن ہوتے ہیں۔ بعضوں کے کان کے عقب میں سوجن ہو جاتی ہے، بعضوں کو بغل میں، پیٹ پر، کبھی پھیپھڑوں سے خون آنے لگتا ہے، اور ایسے بھی تھے جو تپ دق کے مریضوں کی طرح شدت سے کھانستے کھانستے مر جاتے تھے۔ اس نے یہ بڑھا دیا کہ ہر علاقے سے لوگ تین تین پانچ پانچ کی تعداد میں مر رہے ہیں۔ متوحّش، میں نے ہمارے اپنے محلے کی بابت پوچھا۔ تو کیا میں نے نہیں سنا؟ ایک اینٹ چننے والا پڑوسی، جو تمام ہمسایوں سے اس بات پر جھگڑتا کہ ان کی مرغیاں اس کی دیوار سے اند آ جاتی تھیں، بخار میں ہذیان بکتے بکتے کوئی ہفتہ بھر پہلے ہی مرا تھا۔ صرف اب جا کر ہی کہیں لوگوں کو احساس ہوا ہے کہ وہ طاعون سے مرا تھا۔

لیکن میں اب بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا؛ باہر سڑکوں پر ہر شے بالکل معمول کے مطابق نظر آ رہی تھی، کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اس قدر پرسکون تھے، اگر طاعون پھیل گیا تھا تو مجھے اس کا یقین کرنے کے لیے کسی کو ڈھونڈ نکالنا ضروری تھا تاکہ اپنے خوف و ہراس میں اسے اپنا شریک کر سکوں۔ اگلی صبح، جب خوجہ اسکول چلا گیا، میں دوڑ کر سڑکوں پر پہنچا۔ میں نے ان اطالویوں کو تلاش کیا جو مسلمان ہو گئے تھے اور جن سے میری یہاں گزشتہ گیارہ سالوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں کا ایک، جو اپنے نئے نام مصطفیٰ رئیس سے پہچانا جاتا تھا، جہازوں کی مرمت کی گودی پہنچنے کے لیے نکل چکا تھا؛ ایک دوسرا، عثمان افندی، اس نے پہلے تو مجھے گھر کے اندر آنے ہی نہیں دیا، حالانکہ میں اس کا دروازہ اس طرح پیٹتا رہا

گویا اسے گرا کر ہی دم لوں گا۔ اس نے اپنے ملازم سے کہلوایا کہ گھر پر نہیں ہے لیکن آخر میں مزاحمت چھوڑ دی اور چلایا۔ میں اب بھی کیسے یہ شک کر سکتا ہوں کہ بیماری حقیقی نہیں ہے؛ کیا میں نے وہ جنازے نہیں دیکھے جو سڑک پر نکل رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میں سراسیمہ ہوں، وہ یہ میرے چہرے پر صاف صاف دیکھ سکتا ہے، میری سٹی اس لیے گم ہے کہ ہنوز عیسائیت پر قائم ہوں! اس نے مجھے سخت سست کہا؛ یہاں خوش رہنے کے لیے آدمی کا مسلمان ہونا ضروری ہے، لیکن اپنے گھر کے مرطوب اندھیرے میں لوٹتے وقت اس نے میرا ہاتھ ملانے سے غفلت برتی، مجھے بالکل نہیں چھوا۔ یہ نماز کا وقت تھا، اور جب میں نے مسجدوں کے صحنوں میں خلق کا ازدہام دیکھا، تو خوفزدہ ہو کر گھر لوٹ پڑا۔ میں اس سٹپٹاہٹ سے مغلوب ہو گیا تھا جو تباہی کے وقت لوگوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ یہ ایسا تھا جیسے میرا ماضی مجھ سے گم ہو گیا ہو، جیسے میرا سارا حافظہ بہہ کر نکل گیا ہو، مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ افراد کی ایک جماعت جنازہ اٹھائے ہماری محلے کی ایک سڑک پر چلی آ رہی ہے، میرے اوسان بالکل ہی خطا ہو گئے۔

خوجہ اسکول سے واپس آ چکا تھا، مجھے لگا کہ وہ میری حالت دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے خوف نے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ کر دیا ہے اور اس سے مجھے بے چینی ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بے خوفی میں اپنے اس لاحاصل گھمنڈ سے پیچھا چھڑا لے۔ اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش میں میں نے اپنا تمام ترطبی اور ادبی علم باہر انڈیل کر رکھ دیا؛ بقراط، تھوسیدیدیس [Thucydides] اور بکاچیو کے یہاں طاعون کے جو منظر مجھے یاد تھے وہ بیان کیے؛ کہا کہ بیماری کے متعدی ہونے کا عقیدہ رہا ہے، لیکن اس سے وہ کچھ اور زیادہ بدلحاظ ہو گیا ـــ اسے طاعون کا کوئی ڈر ور نہیں تھا؛ بیماری خدا کے ارادے سے ہوتی ہے، اگر آدمی کی تقدیر میں مرنا لکھا ہے تو وہ مر کر رہے گا؛ چنانچہ اس قسم کی بزدلانہ بکواس جو میں کر رہا ہوں بے فائدہ ہے، یہی کہ آدمی اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے اور باہر سے تعلقات منقطع کر لے یا استنبول سے فرار ہونے کی تدبیر کرے۔ اگر یہی نوشتہ تھا، تو ہو کر رہے گا، موت ہمیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں ڈر کیوں رہا ہوں؟ ان معاصی کی بنا پر جو میں نے یوم بعد یوم رقم کیے تھے؟ وہ

مسکرایا، اس کی آنکھیں نورِ یقین سے چمک رہی تھیں۔

اس دن تک جب ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے میں یہ کبھی معلوم نہیں کر سکا کہ جو اس نے کہا تھا اس پر اسے یقین بھی تھا۔ اسے اتنے مکمل طور پر بے خوف دیکھ کر مجھے ایک لمحے کے لیے ڈر لگا، لیکن پھر جب مجھے میز کے گرد ہمارے بحث و مباحثے یاد آئے، وہ ہیبت ناک کھیل جو ہم کھیلتے تھے، تو میں ڈانواڈول ہوگیا۔ وہ بس ایک دائرے میں گھوم رہا تھا، گفتگو کو ان معاصی کی طرف لے جا رہا تھا جو ہم دونوں نے مل کر تحریر کیے تھے، ایک ہی خیال کی ادائے فخر سے تکرار کر رہا تھا جس نے مجھے پاگل کر دیا: اگر میں موت سے اس قدر خوفزدہ ہوں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں نے اس خباثت پر اتنی مہارت حاصل کر لی ہو کہ اس کے بارے میں میں اتنی بے خوفی سے لکھتا ہوا نظر آؤں۔ وہ جرأت مندی جس کا مظاہرہ میں نے اپنے گناہوں کو اتنی فراوانی اور آزادی سے کہہ کر کیا تھا، محض میری بے شرمی کا نتیجہ ہے! جبکہ خود اس کو اس وقت تأمل ہوا تھا کیونکہ وہ اتنی عرق ریزی کے ساتھ اپنی کم ترین کوتاہیوں پر توجہ دے رہا تھا۔ لیکن اب وہ پرسکون تھا، اس گہرے یقین نے جو اس نے طاعون کے روبرو محسوس کیا تھا اس کے دل میں اس شک کا کوئی شائبہ تک باقی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ یقیناً معصوم ہے۔

اس توجیہہ سے مزاحم، جس پر میں نے حماقت میں یقین کر لیا تھا، میں نے اس سے حجت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سادہ لوحی سے تجویز پیش کی کہ اگر وہ پراعتماد تھا تو اس لیے نہیں کہ اس کا ضمیر صاف ہے بلکہ اس لیے کہ اس نہیں معلوم کہ موت کتنے قریب ہے۔ میں نے اس کی وضاحت کی کہ ہم موت کے خلاف اپنا تحفظ کر سکتے ہیں، کہ ہمیں چاہیے کہ ان لوگوں کو چھونے سے اجتناب کریں جنھیں طاعون لاحق ہوگیا ہے، کہ مردہ جسموں کو چونا پڑے گڑھوں میں دفن کیا جانا چاہیے، کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جس قدر کم ہوسکے ملنا جلنا چاہیے، اور کہ خوجہ کو پرہجوم اسکول نہیں جانا چاہیے۔

لگتا ہے کہ اس آخری بات نے اس کے دماغ میں وہ خیالات پیدا کیے جو خود طاعون سے زیادہ ہولناک تھے۔ اگلے دن ٹھیک بارہ بجے، یہ کہہ کر کہ اس نے اسکول میں ہر طالبِ علم کو

باری باری چھوا ہے، اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا؛ جب اس نے مجھے پس و پیش کرتے ہوئے دیکھا، کہ میں اسے چھونے سے خوفزدہ ہوں، وہ میرے قریب آیا اور بڑے سرور کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہوا؛ میں نے چلانا چاہا، لیکن کسی خواب دیکھتے آدمی کی طرح، میری آواز ہی نہ نکلی۔ جہاں تک خوجہ کا تعلق ہے، وہ بولا، ایک استہزا سے جسے سمجھنا میں نے بہت بعد ہی میں سیکھا، کہ وہ مجھے بے خوفی کا درس دے گا۔

(٦)

طاعون بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا، لیکن جانے کیا بات تھی میں وہ نہ سیکھ سکا جسے خوجہ بے خوفی کہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اتنا محتاط نہیں رہا تھا جتنا شروع میں تھا۔ کسی بیمار بڑھیا کی طرح میں ایک ہی کمرے میں مزید بند رہنا، دنوں تک کھڑکی کے باہر تکتے رہنا برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ گاہے بگاہے کسی شرابی کی طرح یکبارگی سڑک پر آدھمکتا، مارکیٹ میں عورتوں کو خرید فروخت کرتے، تاجروں کو اپنی دکانوں میں مصروفِ کار، لوگوں کو اپنے مردے دفنانے کے بعد قہوہ خانوں میں جمع ہوتے دیکھتا، اور طاعون کے باوصف زندہ رہنا سیکھتا، لیکن خوجہ بھلا کہاں مجھے چین سے بیٹھنے دینے والا تھا۔

ہر رات وہ میری طرف اپنے وہی ہاتھ بڑھاتا جن سے اپنے کہنے کے مطابق اس نے سارا دن مختلف لوگوں کو چھوا ہوتا۔ ایک عضلے کو بھی جنبش دیے بغیر میں انتظار کرتا رہتا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ کس طرح، بغیر پوری طرح بیدار ہوئے، آپ کو احساس ہوتا ہے کہ ایک بچھو آپ کے اوپر رینگ رہا ہے اور دم بخود رہ جاتے ہیں، ایک مجسمے کی طرح ساکت — تو بس اسی طرح۔ اس کی انگلیاں میری انگلیوں کے مماثل نہ تھیں؛ خوجہ انھیں میرے بدن پر لاتعلقی سے پھراتے ہوئے پوچھتا: ''کیا تمھیں خوف آرہا ہے؟'' میں جنبش نہ کرتا۔ ''تم خوفزدہ ہو۔ کس چیز

سے ڈر رہے ہو؟'' کبھی کبھی تو مجھ میں ایک لہر سی اٹھتی کہ اسے پرے دھکیل دوں اور لڑ پڑوں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سے اس کا طیش اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ تم کیوں خوفزدہ ہو۔ تم اس لیے خوفزدہ ہو کہ قصوروار ہو۔ تم خوفزدہ ہو کیونکہ گناہ میں غرق ہو۔ تم ڈرے ہوئے ہو کیونکہ تم مجھ پر اس سے زیادہ یقین رکھتے ہو جو میں تم پر رکھتا ہوں۔''

اور یہ وہی تھا جس نے اصرار کیا تھا کہ ہم میز کے دونوں انتہائی سروں پر بیٹھ کر ساتھ ساتھ لکھیں۔ اب جو ہم تھے کیوں تھے لکھنے کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن ایک بار پھر وہ سوائے اس کے کہ ''دوسرے'' کیوں ویسے ہی ہیں جیسے ہیں کچھ اور لکھ لکھا کر نہ دیا۔ پہلی بار اس نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے اپنا لکھا دکھایا۔ جب مجھے خیال آیا کہ وہ کس طرح یہ توقع کیے بیٹھا ہے کہ جو میں پڑھ رہا ہوں وہ مجھے فروتن کردے گا، میں اپنی کراہت چھپا نہ سکا اور کہہ دیا کہ وہ ان احمقوں سے مختلف نہیں جن کی بابت لکھ رہا ہے اور یہ کہ وہ مجھ سے پہلے مر جائے گا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میری یہ پیشین گوئی میرا سب سے کارگر ہتھیار ہے، اور اسے اس کی دہ سالہ عرق ریزی کی یاددہانی کرائی، وہ سال جو اس نے کوسموگرافی کے نظریات پر لگائے تھے، اپنی بینائی کے صرفے پر آسمانوں کے مشاہدات پر، وہ تمام دن جب اس نے کتاب سے ناک نہیں اٹھائی تھی۔ تو اب اسے چین سے بیٹھنے نہ دینے کی میری باری تھی؛ میں نے کہا کہ یہ کتنی احمقانہ بات ہوگی کہ وہ بے سود ہی جاں بحق ہو جبکہ طاعون سے بچنا اور جیے جانا بالکل ممکن ہے۔ ان باتوں سے نہ صرف میں نے اس کے شکوک میں اضافہ کیا بلکہ اپنی سزاؤں میں بھی۔ تب میں نے دیکھا، یوں لگ رہا تھا کہ میرے لکھے کو پڑھتے پڑھتے، میری وہ عزت جو اس نے کھو دی تھی اس کی بادلِ ناخواستہ بازیافت کر رہا ہو۔

تو ان دنوں اپنی بدقسمتی کو بھلا دینے کے لیے میں نے صفحے کے صفحے ان پُرمسرت خوابوں سے بھر دیے جو مجھے اکثر نظر آتے، رات ہی کو نہیں، بلکہ دوپہر کو قیلولے کے وقت بھی۔ سب کچھ فراموش کر دینے کی کوشش میں، آنکھ کھلتے ہی میں ان خوابوں کو رقم کرنے لگتا جن میں عمل اور معنی یکساں ہو گئے تھے، اور اپنے اسلوب کو شاعرانہ بنانے کے واسطے سخت محنت کرتا:

میں نے خواب دیکھا کہ ہمارے گھر کے قریب جنگل میں لوگ رہتے ہیں جنھوں نے ان اسرار کو حل کرلیا ہے جنھیں ہم سالوں تک سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور اگر آدمی اس جنگل کے اندھیرے میں داخل ہونے کی جرأت کرے تو ان کا دوست بن سکتا ہے؛ غروبِ آفتاب سے ہماری پرچھائیاں مٹ نہیں جاتیں، بلکہ اپنی ایک مستقل زندگی اختیار کرلیتی ہیں، ہزارہا چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنے قبضۂ قدرت میں لے آتی ہیں جن پر ہمیں اس تمام وقت میں قدرت حاصل کرلینی چاہیے تھی جو ہم نے اپنے صاف ستھرے اور فرحت بخش بستروں میں سکون کی نیند سونے میں گزارا تھا؛ ان شکیل، سہ بُعدی لوگوں نے جن کی تصویر میں نے اپنے خوابوں میں وضع کی تھی اپنے تصویری چوکھٹوں کے باہر قدم رکھا اور ہمارے ساتھ گھل مل گئے؛ میری ماں، میرا باپ اور میں نے اپنے پائیں باغ میں فولاد کی مشینیں نصب کیں جو ہمارے بجائے ہمارا کام کرسکیں...

خوجہ بے خبر نہیں تھا کہ یہ سپنے وہ شیطانی دام ہیں جو اسے ایک مہلک سائنس کے اندھیرے میں گھسیٹ لائیں گے، اس کے باوجود بھی وہ مجھ سے برابر سوال کرتا رہا، اس سے پوری طرح آگاہ کہ ہر سوال کے ساتھ ہی وہ اپنی خوداعتمادی کا ایک اور ٹکڑا کھو رہا ہے: ان احمقانہ خوابوں کا مطلب کیا ہے، کیا میں نے واقعی اِنھیں دیکھا ہے؟ چنانچہ میں نے اسے بالکل اسی طرح اپنا تختۂ مشق بنایا جس طرح سالوں بعد ہم دونوں مل کر سلطان کو بنانے والے تھے؛ میں نے اپنے خوابوں سے ہم دونوں کے مستقبل کے بارے میں نتائج برآمد کیے: یہ ظاہری بات تھی کہ ایک بار آدمی سائنس کی کشش سے گھائل ہوجائے تو پھر اس سے گلوخلاصی اتنی ہی ناممکن ہے جتنی طاعون سے؛ یہ کہنا مشکل نہیں تھا کہ یہ لت خوجہ پر پوری طرح حاوی ہوچکی تھی، لیکن اس کے باوجود میں خوجہ کے خوابوں کے بارے میں سوچتا رہا! وہ سنتا، کھلم کھلا میرا تمسخر اڑاتا، لیکن چونکہ اس نے اپنے گھمنڈ کو اس حد تک پی لیا تھا کہ مجھ سے سوال کرے، میری خفگی کو بہت زیادہ نہیں بھڑکا سکتا تھا؛ اور مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ میرے جوابات اس کے تجسس کو ابھار رہے ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ طاعون پھیلنے کی بابت خوجہ نے جس بےفکری کا مظاہرہ کیا تھا وہ

مضطرب ہونے لگی ہے، خود میرے خوفِ مرگ میں تخفیف نہیں ہوئی، لیکن کم از کم یہ ضرور ہوا کہ اب اس خوف میں میں خود کو تنہا نہیں محسوس کررہا تھا۔ ظاہر ہے، مجھے اس کے شبانہ عذابوں کی قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن اب مجھے یہ احساس ہوا کہ میری جدوجہد رائگاں نہیں گئی: جب خوجہ نے اپنے ہاتھ میری جانب بڑھائے تو میں نے دوبارہ کہا کہ اسے مجھ سے پہلے موت آئے گی، اور یہ یاددہانی کرائی کہ جو خوفزدہ نہیں ہیں لاعلم ہیں، کہ اس کی تحریریں ادھوری ہی رہ گئی ہیں، اور میرے وہ خواب جو اس دن اس نے پڑھے ہیں مسرت سے لبریز ہیں۔

بہرکیف، یہ میرا کہا ہوا نہیں بلکہ کوئی اور ہی بات تھی جس نے معاملے کو فیصلہ کن حدود میں داخل کردیا۔ ایک دن اس کے اسکول کے ایک بچے کا باپ گھر آیا۔ وہ بےضرر، منکسر، معمولی سا آدمی لگ رہا تھا، بولا کہ ہمارے ہی پڑوس میں رہتا ہے۔ میں، کسی گھریلو اونگھتی ہوئی بلی کی طرح اپنے کونے میں سمٹا سمٹایا بیٹھا، اسے سنتا رہا، درایں حالیکہ وہ دونوں ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول رہے۔ پھر ہمارے مہمان نے اچانک وہ کہہ دیا جو کہنے کو بےقرار تھا: اس کی بنتِ عم گزشتہ گرمیوں میں بیوہ ہوگئی ہے، اس کا شوہر چھت بچھاتے ہوئے گر کر مرگیا تھا۔ کئی آدمی اس سے شادی کرنے کے طلب گار ہیں، لیکن ہمارے ملاقاتی کو خوجہ کا خیال آیا کیونکہ اسے پڑوسیوں سے معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں شادی کے پیغام اس کے زیرغور ہیں۔ خوجہ کا ردعمل میری توقع سے کہیں زیادہ ظالمانہ ثابت ہوا: بولا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا، اور اگر چاہتا بھی تو ایک بیوہ سے ہرگز نہیں۔ اس پر ہمارے مہمان نے ہمیں یاد دلایا کہ ہمارے پیغمبر محمد نے خدیجہ کی بیوگی کا خیال نہیں کیا تھا اور انھیں اپنی پہلی زوجہ بنالیا تھا۔ خوجہ بولا کہ اس نے اس بیوہ کے بارے میں سنا ہے، وہ ولی صفت خدیجہ کی چھنگلی برابر بھی نہیں۔ اس پر ہمارے عجیب اور گھمنڈی ہمسایے نے خوجہ کو یہ باور کرانا چاہا کہ وہ خود بھی کوئی ایسی نعمت غیرمترقبہ نہیں، اور یہ بھی کہا کہ گو اسے خود تو یقین نہیں لیکن ہمسایوں کا خیال ہے کہ خوجہ کا دماغ بالکل چل گیا ہے، کوئی بھی متنفس اس کی اختر شماریوں کو اچھی نشانی نہیں سمجھتا، یہ اس کا عدسوں سے کھیلنا کھالنا اور عجیب وغریب گھڑیاں بنانا۔ کسی بیوپاری کی تنک مزاجی سے، جو اس مال پر نکتہ چینی کررہا ہو جسے

خریدنے والا ہو، ہمارے مہمان نے یہ اضافہ بھی کیا کہ پڑوسی کہہ رہے تھے کہ خوجہ کفار کی طرح میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے، بجائے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے؛ کہ تھیلی کے بعد پیسوں کی تھیلی کے عوض کتابیں خریدتا ہے پھر انھیں فرش پر پھینک کر ان کے اوراق پیروں تلے روندتا ہے جن پر آنحضرت کا نام لکھا ہوتا ہے؛ کہ گھنٹوں آسمان کو گھور کر اپنے اندر کے شیطان کی تشفی کرنے میں ناکام رہنے کے بعد، اب اپنے بستر میں پڑا پڑا دن دہاڑے اپنی غلیظ سی چھت کو تکتا رہتا ہے، عورتوں کو چھوڑ کر صرف لونڈوں ہی سے متمتع ہوتا ہے، کہ میں اس کا توام بھائی ہوں، کہ اس نے رمضان بھر روزہ نہیں رکھا اور کہ طاعون صرف اس کی وجہ سے بھیجا گیا ہے۔

ملاقاتی سے پیچھا چھڑانے کہ بعد خوجہ پر برہم مزاجی کا دورہ پڑا۔ میں نے طے کیا کہ دوسروں جیسے رویے رکھنے سے، یا کم از کم ان کا دکھاوا کرنے سے، جو آسودہ خاطری وہ اخذ کرتا تھا، اب اپنے خاتمے کو پہنچ گئی ہے۔ ایک آخری اور فیصلہ کن ضرب دینے کے لیے میں نے کہا کہ وہ جنھیں طاعون کا خوف نہیں، اتنے ہی احمق ہیں جتنا یہ شخص تھا۔ وہ ڈر گیا، لیکن زور دے کر بولا کہ وہ بھی طاعون سے خوفزدہ نہیں ہے۔ وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو، میں نے فیصلہ کیا کہ یہ بات اس نے اخلاص سے کہی ہے۔ اس کے اعصاب پر شدید تشنج طاری تھا، کوئی چیز نہیں مل رہی تھی کہ ہاتھوں کو مصروف رکھے، اور ''احمقوں'' کی وہی گردان کرتا رہا جو قریبی زمانے میں بھول بھال گیا تھا۔ رات پڑنے پر اس نے چراغ روشن کیا، میز کے بیچوں بیچ رکھا، اور بولا کہ اب ہم بیٹھیں گے۔ ہمیں لکھنا چاہیے۔

دو غیر شادی شدوں کی طرح جو سردیوں کی غیر مختتم راتوں میں وقت گزاری کی خاطر ایک دوسرے کی قسمت کا حال بتا رہے ہوں، ہم میز پر روبرو ہو کر بیٹھ گئے، اور اپنے سامنے کورے کاغذوں پر کچھ نہ کچھ گھسیٹنے لگے۔ کیا مہملیت تھی! جب صبح کو میں نے خوجہ کا نوشتہ خواب پڑھا، تو وہ مجھے اپنے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ اس نے جو خواب رقم کیا تھا اس میں میری نقالی کی تھی، لیکن جیسا کہ اس کی ہر بات سے صاف ظاہر تھا، یہ ایک ایسا فنطاسیہ تھا جو کبھی خواب میں نہیں دیکھا گیا تھا: اس نے ہمیں بھائی بھائی دکھایا! اسے یہ مناسب معلوم ہوا کے خود کو

میرے بڑے کے روپ میں پیش کرے جب کہ میں بڑی اطاعت گزاری سے اس کے سائینٹیفک لیکچر سنوں۔ اگلی صبح جب ہم ناشتہ کر رہے تھے، اس نے پوچھا کہ ہمارے توام ہونے سے متعلق پڑوسیوں کی لاف گزاف کے بارے میں میرا کیا خیال ہے۔ اس سوال سے مجھے مسرت ہوئی لیکن میرے فخر کی تسکین نہیں؛ میں نے کچھ نہیں کہا۔ دو دن بعد اس نے بیچ رات میں یہ کہنے کے لیے جگا دیا کہ اس بار اس نے سچ مچ وہی خواب دیکھا ہے جو لکھا تھا۔ شاید یہ ٹھیک ہو، لیکن کسی وجہ سے میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اگلی شب اس نے اقرار کیا کہ وہ طاعون میں مرنے سے خوفزدہ ہے۔

گھر میں بند پڑے رہنے سے وحشت زدہ ہو کر میں جھٹ پٹے کے وقت باہر سڑک پر نکل آیا: باغ میں بچے درختوں پر چڑھ رہے تھے اور اپنے رنگ برنگے جوتے نیچے زمین پر چھوڑ دیے تھے؛ فوّاروں کے پاس قطار میں کھڑی بک بک کرتی عورتیں میرے ان کے پاس سے گزرتے وقت خاموش نہیں ہو رہی تھیں؛ بازار گاہکوں سے پُر تھے؛ سرِ راہ جھگڑے ہو رہے تھے جنھیں کچھ لوگ منتشر کرا رہے تھے اور کچھ دوسرے ان سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وبا اپنی میعاد پوری کر چکی ہے، لیکن جب میں نے مسجدِ بایزید سے ایک کے بعد ایک جنازہ نکلتے دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے اور گھر واپس آ گیا۔ جوں ہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا، خوجہ نے آواز دی: ''ارے، ذرا یہاں آ کر اسے دیکھو۔'' اس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور وہ ایک ہلکی سی سوجن کی طرف اشارہ کر رہا تھا، ناف کے نیچے ایک سرخ سا دھبا۔ ''آس پاس اتنے بہت سی کیڑے مکوڑے ہیں۔'' میں نے قریب آ کر غور سے دیکھا، یہ ایک چھوٹا سا سرخ دھبا تھا، جس پر ہلکی سی سوجن تھی، جیسے کسی کیڑے کے کاٹنے کا بڑا سا نشان، لیکن وہ یہ مجھے کیوں دکھا رہا ہے؟ میں اپنا چہرا اور قریب لاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ''کیڑے کی کاٹ ہے،'' خوجہ بولا، ''ہے نا؟'' اس نے سوجن کی نوک اپنی انگلی سے چھوئی۔ ''یا پِسّو کی ہے؟'' میں خاموش رہا، میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں نے پسو کا ایسا کاٹا کبھی نہیں دیکھا۔

میں نے باغ میں غروبِ آفتاب تک رہنے کا کوئی بہانہ تلاش کرلیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے مزید اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے، لیکن میرے ذہن میں کوئی اور جگہ بھی نہیں آئی جہاں جاسکوں۔ اور وہ نشان واقعی کسی کیڑے کے ڈنک مارنے کا ہی لگ رہا تھا، وہ طاعون کی گلٹی کی طرح نمایاں اور پھیلا ہوا نہیں تھا؛ لیکن میرے خیالات جلد ہی کسی اور طرف چل پڑے: چونکہ میں باغ میں لہلہاتے پودوں کے درمیان گھومتا پھر رہا تھا، مجھے یوں لگا کہ دو دن کے اندر اندر وہ سرخ نشان خوب پھول جائے گا، غنچے کی طرح کھلے گا، اور پھوٹ پڑے گا، کہ خوجہ جاں بحق ہوگا، اذیت کے ساتھ۔ میں نے خود سے کہا کہ یہ بدہضمی کا پیدا کیا ہوا کوئی پھوڑا ہو، لیکن نہیں، یہ کیڑے کے کاٹنے کا نشان ہی لگ رہا تھا، کس کیڑے کا یہ ایک لمحے میں مجھے یاد آجائے گا، ہو نہ ہو یہ انھیں میں کا ایک کیڑا ہوگا جو جسامت میں بڑے ہوتے ہیں اور رات کے وقت اڑتے پھرتے ہیں اور استوائی آب وہوا میں خوب پھلتے پھولتے ہیں، لیکن اس بھوت جیسی مخلوق کا نام تک میرے نوکِ زباں پر آ کر نہ دیا۔

جب ہم رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو خوجہ نے خود کو بہت ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی، مذاق کیے، مجھے ستایا، لیکن یہ سوانگ بہت دیر تک جاری نہ رکھ سکا۔ بہت بعد میں، جب ہم کھانا کھا کر اٹھ چکے تھے، جو ہم نے خاموشی میں کھایا تھا، اور رات، بے ہوا اور پرسکوت، ٹِک چکی تھی، خوجہ بولا، ''میں اتاولا محسوس کررہا ہوں۔ میں خیالات سے بوجھل ہوں۔ چلو میز پر بیٹھ کر لکھیں۔'' بظاہر اپنی توجہ بٹانے کا اس کے پاس بس یہی ذریعہ رہ گیا تھا۔

لیکن وہ لکھ نہیں سکا۔ بیکار بیٹھا اپنی آنکھ کے گوشے سے مجھے دیکھتا رہا، جبکہ میں قناعت کے ساتھ لکھتا چلا گیا۔ ''کیا لکھ رہے ہو؟'' میں نے پڑھ کر سنا دیا کہ اپنی انجینئری کے مطالعے کا پہلا سال ختم کرنے کے بعد میں تعطیل گزارنے کس قدر بے صبری سے یک اپسی گاڑی میں گھر لوٹنے کا منتظر تھا۔ لیکن مجھے اپنے مکتب اور اپنے ساتھیوں دونوں ہی سے محبت تھی؛ میں نے اسے پڑھ کر سنایا کہ میں نے چشمے کے کنارے وہ کتابیں پڑھتے ہوئے جو تعطیلات میں ساتھ لیتا آیا تھا ان کی کس قدر شدید کمی محسوس کی تھی۔ ایک مختصر خاموشی کے بعد، خوجہ نے، جیسے کسی راز

سے پردہ اٹھا رہا ہو، اچانک میرے کان میں سرگوشی کی: ''کیا لوگ وہاں ہمیشہ ہی اسی طرح خوش رہتے ہیں؟'' مجھے خیال ہوا کہ یہ کہتے ہی وہ اس پر پچھتائے گا، لیکن وہ مجھے ہنوز بچکانہ تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی سرگوشی کی: ''میں خوش تھا!'' رشک کی ایک پرچھائیں سی اس کے چہرے پر سے ہوکر گزر گئی، لیکن اس میں ڈرانے دھمکانے والا انداز نہیں تھا۔ کم آمیزی سے، رکتے جھجکتے، اس نے اپنی کہانی سنائی۔

جب اس کی عمر بارہ سال تھی اور اَیدرنہ میں رہ رہا تھا، ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مسجدِ بایزید کے شفاخانے اپنے نانا کی مزاج پرسی کے لیے جاتا تھا جو پیٹ کی کسی بیماری میں مبتلا تھا۔ صبح کے وقت اس کی ماں اس کے بھائی کو، جو ابھی بہت چھوٹا تھا، محلے والوں کی نگرانی میں چھوڑ آتی، اور پھر خوجہ، اس کی بہن، اور پڈنگ کے پیالے کے ساتھ، جو ماں نے پہلے سے تیار کی ہوتی، نکل پڑتی؛ سفر مختصر لیکن دلکش ہوتا، اور اس گزرگاہ پر جو سفیدے کے درختوں کی چھاؤں سے ہوکر جاتی تھی۔ اس کا نانا انھیں کہانیاں سناتا۔ خوجہ کو وہ کہانیاں بہت بھاتی تھیں، لیکن ان سے زیادہ شفاخانہ اور اس کے صحنوں اور غلام گردشوں میں گھومتے پھرنا۔ ایک بار اسے وہ موسیقی بھی سنائی دی جو ایک بہت بڑے گنبد کے فانوس کے نیچے ذہنی مریضوں کے لیے بجائی جارہی تھی؛ پھر پانی، بہتے پانی کی آواز بھی تھی؛ وہ دوسرے کمروں میں بھی جانکلتا، جن میں عجیب قسم کی رنگ برنگی بوتلیں اور مرتبان چمک رہے ہوتے؛ ایک اور مرتبہ وہ اپنا راستہ بھول بیٹھا، رونے لگا، اور منتظمین اسے فرداً فرداً ہر کمرے میں لے گئے تاآنکہ انھیں اس کے نانا عبداللہ افندی کا کمرہ مل گیا؛ کبھی اس کی ماں آنسو بہانے لگتی، کبھی اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر بوڑھے آدمی کی کہانیاں سنتی۔ پھر وہ نانا کا لوٹایا ہوا خالی برتن لے کر وہاں سے رخصت ہوتے، لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ماں ان دونوں کو حلوہ خرید کر دیتی اور سرگوشی میں کہتی، ''چلو اسے دوسروں کے دیکھنے سے پہلے ہی کھا پی لیں۔'' سفیدوں کی چھاؤں میں چشمے کے قریب وہ ایک خفیہ مقام پر آتے جہاں تینوں پانی میں اپنے پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے، اور لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ حلوہ کھاتے۔

جب خوجہ نے بات ختم کی ایک خاموشی اتر آئی، جس نے ہمیں مضطرب کر دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک سمجھ میں نہ آنے والے جذبۂ اخوت میں ایک دوسرے سے قریب بھی۔ بڑی دیر تک خوجہ فضا میں جو تناؤ آ گیا تھا اسے نظرانداز کرتا رہا۔ بعد میں، ایک قریبی گھر کا بھاری دروازہ لاپروائی سے بڑے زور سے بند کیا گیا تو اس نے کہا کہ اسے سب سے پہلی بار سائنس سے دلچسپی اسی وقت ہوئی، اس کا محرک مریض اور وہ رنگ برنگی بوتلیں اور مرتبان اور ترازو تھے جو انھیں تندرست کرتے تھے۔ لیکن نانا کی وفات کے بعد وہ دوبارہ وہاں نہیں گئے۔ خوجہ ہمیشہ یہ خواب دیکھتا رہا تھا کہ بڑا ہونے پر وہ اکیلا وہاں لوٹے گا، لیکن ایک سال دریائے تُنجہ میں جو اَیدرنہ سے ہو کر بہتا ہے بغیر کسی انتباہ کے سیلاب آ گیا، مریضوں کو ان کے بچھونوں سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا کیونکہ کمرے غلیظ گدلے پانی سے بھر گئے تھے، اور جب آخر کار پانی اترا تو وہ خوشنما شفاخانہ برسوں ایک منحوس، متعفن کیچڑ کے نیچے دبا رہا جسے صاف کرنا ناممکن تھا۔

جوں ہی خوجہ دوبارہ خاموش ہوا، ہماری قربت کا لمحہ بھی رخصت ہو گیا۔ وہ میز سے اٹھ چکا تھا، اپنی آنکھ کے گوشے سے میں نے اس کی پرچھائیں کو کمرے میں قدم ناپتے دیکھا، پھر چراغ کو میز کے بیچ سے اٹھا کر وہ میرے پیچھے آ گیا، اور اب نہ مجھے خوجہ نظر آ رہا تھا نہ اس کی پرچھائیں؛ میں مڑ کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا؛ جیسے خوفزدہ ہوں، کسی شر کا متوقع۔ ایک لمحے بعد، کپڑوں کے اتارے جانے کی سرسراہٹ سن کر، میں ڈرتے ڈرتے مڑا۔ وہ آئینے کے مقابل کھڑا تھا، کمر سے اوپر ننگ منتگ، چراغ کی روشنی میں بڑی احتیاط سے اپنے سینے اور زیریں شکم کا معائنہ کر رہا تھا۔ ''خدایا،'' وہ بولا، ''یہ کس قسم کا دمّل ہے؟'' میں خاموش رہا۔ ''آ کر دیکھو تو سہی۔'' میں نے جنبش تک نہ کی۔ وہ چلایا، ''یہاں آؤ، میں کہتا ہوں!'' میں ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھا، ایک طالبِ علم کی طرح جسے بس اب سزا ملنے ہی والی ہو۔

میں کبھی اس کے ننگے جسم سے اتنے قریب نہیں ہوا تھا؛ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ پہلے میں نے یہ یقین کرنا چاہا کہ میرے آگے نہ بڑھنے کی یہی وجہ ہو، لیکن مجھے معلوم تھا میں اس کے دمّل سے ڈرا ہوا ہوں۔ یہ اسے خود بھی معلوم تھا۔ تاہم، اپنے خوف کو چھپانے کے لیے میں اپنا

سر قریب لایا اور ایک معالج کے انداز میں کچھ بڑبڑایا، دراں حالیکہ میری نگاہیں اس سوجن، اس سوزش پر جمی ہوئی تھیں۔ ''تمھیں ڈر لگ رہا، لگ رہا ہے نا؟'' آخر کار خوجہ نے کہا۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش میں کہ مجھے ڈر نہیں لگ رہا، میں اپنا سر کچھ اور قریب لایا۔ ''تمھیں ڈر ہے کہ کہیں یہ طاعون کی گلٹی نہ ہو۔'' میں نے نہ سننے کا روپ بھرا، اور یہ کہنے ہی والا تھا کہ اسے کسی کیڑے نے کاٹا ہے، شاید اسی عجیب کیڑے نے جس نے مجھے بھی، کہیں، ایک بار ڈنک مارا تھا، لیکن کیڑے کا نام اب بھی مجھے یاد نہ آ سکا۔ ''اسے چھو کر دیکھو!'' خوجہ نے کہا۔ ''بغیر چھوے تمھیں کیسے پتا چلے گا؟ مجھے چھوؤ!''

جب اس نے دیکھا کہ میں چھونے والا نہیں، وہ کھِل اٹھا۔ اس نے وہ انگلیاں میرے چہرے کی طرف بڑھائیں جن سے اس نے سوجن کو چھوا تھا۔ جب اس نے مجھے کراہت سے پیچھے ہٹتے دیکھا تو بڑے زور سے ہنسا، اور ایک معمولی سے کیڑے کی کاٹ سے اتنے خوفزدہ ہو جانے پر میرا مذاق اڑایا، لیکن ٹھٹھے بازی دیر تک قائم نہیں رہی۔ ''میں مرنے سے خوفزدہ ہوں،'' اس نے اچانک کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی چیز کی بات کر رہا ہو؛ وہ شرمسار سے زیادہ خفا تھا؛ یہ کسی ایسے شخص کا غصہ تھا جس کے ساتھ غداری کی گئی ہو۔ ''کیا تمھارے ایسا پھوڑا نہیں؟ کیا تمھیں یقین ہے؟ چلو قمیص اتارو، ابھی ابھی!'' اس کے اصرار پر میں نے ایک بچے کی طرح جو دھلائے جانے سے ناراض ہو اپنی قمیص اتار دی۔ کمرہ گرم تھا، کھڑکی بند تھی، تاہم ٹھنڈی ہوا کہیں سے اندر آ رہی تھی؛ شاید یہ آئینے کی ٹھنڈک تھی جس نے میرے جسم میں سنسنی پیدا کر دی، مجھے نہیں معلوم۔ کیسا نظر آؤں گا، اس خیال سے مجھے ندامت محسوس ہوئی اور میں آئینے کے چوکھٹے کے باہر ہو گیا۔ جب خوجہ نے اپنا سر میرے دھڑ کے نزدیک کیا تو مجھے آئینے میں اس کا چہرا ترچھا منعکس نظر آیا؛ اس نے اپنا وہ بڑا سا سر جو ہر ایک یہی کہتا تھا کہ میرے سر سے ملتا جلتا ہے سیدھا میرے جسم کی طرف بڑھایا۔ وہ یہ میرے نفس میں زہر گھولنے کے لیے کر رہا ہے، مجھے اچانک خیال آیا؛ لیکن میں نے ایسا اس کے ساتھ کبھی نہیں کیا ہے، اس کے برعکس، ان تمام سالوں میں میں نے اس کا استاد ہونے پر فخر کیا ہے۔ ہرچند کہ یہ بالکل مہمل بات تھی،

تاہم ایک لمحے کے لیے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ داڑھی والا سر، جو چراغ کی پرچھائیوں میں بڑا بے ہنگم نظر آ رہا تھا، میرا خون چوس جانے کے درپے ہے! ظاہر ہے یہ ان ہیبت ناک کہانیوں کا اثر تھا جو میں نے ایک بچے کی حیثیت سے سنی تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے اپنے زیریں شکم پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کیا؛ میں نے بھاگ جانا چاہا، کوئی چیز اس کے سر پر دے مارنا۔ ''تمھیں نہیں ہے،'' وہ بولا۔ وہ میرے پیچھے آیا اور میری بغلوں، میری گردن، میرے کانوں کے عقب کا معائنہ کیا۔ ''یہاں بھی ایک نہیں، لگتا ہے کیڑے نے تمھیں نہیں کاٹا۔''

میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ آگے آیا اور میرے برابر کھڑا ہوگیا۔ اس کا طرزِ عمل کسی پرانے عزیز دوست کا سا تھا جو میرے عمیق ترین رازوں میں میرا شریک رہا ہو۔ دونوں طرف سے اپنی انگلیوں سے میری گدی دبا کر اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ ''آؤ، ساتھ ساتھ آئینے میں دیکھیں۔'' میں نے دیکھا، اور چراغ کی کھردری روشنی میں ایک بار پھر دیکھا کہ ہم دونوں کس قدر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ صادق پاشا کے دروازے پر انتظار کرتے وقت جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس مشابہت سے کس درجہ مغلوب ہوگیا تھا۔ اُس وقت میں نے کسی ایسے کو دیکھا تھا جیسا مجھے ہونا چاہیے تھا؛ اور اِس وقت میں نے سوچا کہ اسے بھی مجھ جیسا ہی ہونا چاہیے۔ ہم دونوں ایک ہی شخص ہیں! اب یہ مجھے ایک بالکل ظاہری بات لگ رہی تھی۔ ایسا ہے جیسے جکڑا ہوا ہوں، میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، ہلنے جلنے سے عاجز۔ اپنی حفاظت کے لیے میں نے جنبش کی، تاکہ تصدیق کرسکوں کہ میں، میں ہی ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ بالوں میں پھرائے۔ لیکن اس نے میری حرکات کی نقالی کی اور انھیں بڑی تکمیل کے ساتھ انجام دیا، بغیر اس کے کہ آئینے میں منعکس پیکر کا تناسب ذرا بھی مضطرب ہو۔ اس نے میرے انداز کی نقالی بھی کی، میرے سر کے رجحان کی بھی، میری اس دہشت کی نقل اتاری جسے آئینے میں دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی لیکن جس سے، خوف کے مارے دم بخود، اپنی آنکھیں بھی نہیں ہٹا سکتا تھا؛ پھر وہ کسی بچے کی طرح مسرور ہوگیا جو اپنے دوست کے الفاظ اور حرکات کی نقالی کر کے اسے چڑا رہا ہو۔ اس نے چلا کر کہا کہ ہم دونوں

ساتھ ساتھ مریں گے! کیا حماقت ہے، میں نے سوچا۔ لیکن میں خوفزدہ بھی تھا۔ یہ سب سے زیادہ دہشت ناک رات تھی جو میں نے اس کے ساتھ گزاری۔

پھر اس نے بتایا کہ تمام وقت طاعون سے خوفزدہ رہا ہے، ہر وہ چیز جو اس نے کی ہے صرف میری آزمائش کے لیے ہی کی ہے، مثلاً جب وہ صادق پاشا کے جلادوں کو قلع قمع کرنے کے لیے مجھے لے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، یا جب لوگ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے مشابہ قرار دیتے تھے۔ پھر بولا کہ وہ میرے نفس پر قابض ہوگیا ہے؛ بالکل جیسے ایک لمحہ پہلے وہ میری حرکات کی عکاسی کر رہا تھا، بالکل اسی طرح اس وقت وہ سب جو میں سوچ رہا ہوں، اسے معلوم ہے، اور جو کچھ مجھے معلوم ہے، وہ بھی وہی سوچ رہا ہے! جب اس نے پوچھا کہ میں لمحۂ موجودہ میں کیا سوچ رہا ہوں، میں سوائے اس کے کسی اور چیز کی بابت نہ سوچ سکا اور بولا کہ کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہا، لیکن وہ سن نہیں رہا تھا، وہ کچھ دریافت کرنے کے لیے باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ صرف مجھے ڈرانے کے لیے، خود اپنے خوف پر میرے جذبات ابھارنے کے لیے، مجھے اس خوف کے بوجھ کو اپنے ساتھ سہنے پر مجبور کرنے کے لیے۔ مجھے لگا کہ اپنی تنہائی کے احساس کے بہ قدر، وہ میری ایذا دہی کا طلب گار ہے؛ جب اس نے اپنی انگلیاں ہمارے چہروں پر پھرائیں، اس پراسرا مشابہت کی ہیبت سے مجھے سحرزدہ کرنے کی کوشش کی اور خود مجھ سے زیادہ خیزش اور اضطراب میں آ گیا، مجھے لگا جیسے وہ کوئی گھناونی بات کر گزرنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے سے کہا کہ اگر وہ مجھے مسلسل آئینے کے مقابل کیے ہوئے ہے، میری گدی دبائے ہوئے ہے، تو اس لیے کہ اس کا دل فوراً اس شر کے ارتکاب پر راضی نہیں، لیکن وہ نہ مہمل لگ رہا ہے نہ بے یار و مددگار۔ وہ درست تھا، میں بھی وہی باتیں کہنا اور کرنا چاہتا تھا جو وہ، مجھے اس پر رشک تھا کہ جہاں وہ عملی قدم اٹھا سکتا تھا، میں نہیں، کیونکہ وہ طاعون کے خوف اور آئینے سے فائدہ اٹھانے کا اہل تھا۔

لیکن اپنے خوف کی شدت سے قطعِ نظر، حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میں نے اپنے بارے میں ابھی ابھی وہ چیزیں دیکھی ہیں جن پر پہلے میری توجہ نہیں گئی تھی، میں کسی وجہ سے اس

احساس کو نہ جھٹک سکا کہ یہ سب ایک کھیل ہے۔ میری گردن پر اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی، لیکن میں آئینے کے چوکھٹے کے باہر قدم نے دھر سکا۔ ''اب میں تم جیسا ہوں،'' وہ بولا۔ ''مجھے تمھارے خوف کا علم ہے۔ میں، تم بن گیا ہوں!'' جو وہ کہہ رہا تھا میں سمجھ گیا لیکن خود کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ پیشین گوئی، جس کے نصف کے بارے میں اب مجھے کوئی شک نہیں رہا، احمقانہ اور بچکانے تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کو میری آنکھ سے دیکھ سکتا ہے؛ ''وہ،'' وہ پھر کہہ رہا تھا، آخر کار اب اسے اس نے سمجھ لیا تھا کہ ''وہ'' کس طرح سوچتے ہیں، ''انھیں'' کیسا لگتا ہے۔ اپنی نگاہ کو آئینے کے چوکھٹے کے ماورا بھٹکتا رہنے دیتے ہوئے، وہ کچھ دیر تک بولتا رہا، میز کے قریب پرچھائیوں کو، گلاسوں کو، کرسیوں کو، اور چراغ کی روشنی میں نیم واضح اشیا کو دیکھتا رہا۔ اس نے اعلان کیا کہ اب وہ ایسی باتیں کہہ سکتا ہے جو پہلے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ انھیں دیکھنے کے قابل نہیں تھا، لیکن مجھے خیال ہوا کہ وہ غلطی پر ہے: الفاظ ہو بہو وہی تھے، اور اشیا بھی پہلے جیسی ہی۔ صرف اس کا خوف نیا تھا؛ نہیں، وہ بھی نہیں؛ بلکہ اس کو محسوس کرنے کی اس کی وضع؛ لیکن مجھے لگا کہ یہ بھی، جسے اب میں وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا، ایک ایسی چیز ہے جو اس نے آئینے کے سامنے اپنے پر منڈھ لی ہے، اس کی تازہ بتازہ چال۔ اور طوعاً و کرہاً اس کھیل کو بھی ایک طرف ڈال کر، اس کا ذہن چکر لگا کر اُس لال دمّل پر مرتکز ہوتا نظر آیا، یہ پوچھتے ہوئے: کیا یہ کوئی کیڑا تھا یا طاعون؟

وہ کچھ دیر تو اس بارے میں بولتا رہا کہ جس مقام پر پہنچ کر میں ٹھہر گیا ہوں، وہ اسی مقام سے آگے جاری رہنے کا کس قدر متمنی ہے۔ ہم ابھی تک آئینے کے روبرو نیم برہنہ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ میری جگہ لینے والا تھا، میں اس کی، اور اسے انجام دینے کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ اپنے کپڑوں کا تبادلہ کریں، وہ اپنی داڑھی مونڈ ڈالے، اور میں اپنی بڑھنے دوں۔ اس خیال نے آئینے میں ہماری مشابہت کو اور زیادہ مکروہ بنا دیا، اور اسے یہ کہتے ہوئے سنتے کہ پھر میں اسے ایک آزاد کردہ آدمی بنا دوں گا میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا: اس نے فرطِ مسرت سے اِترا کر کہا کہ وہ میرے بجائے میرے وطن لوٹنے پر کیا کچھ کرے گا۔ اس احساس

سے مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی کہ اسے ہر وہ بات جو میں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کی بابت بتائی تھی مِن وعَن یاد تھی، اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک، اور ان تفاصیل سے اس نے اپنے ذوق کے مطابق ایک عجیب وغریب، حقیقت سے دور سرزمین بنا ڈالی تھی۔ میری زندگی میرے قابو سے باہر تھی، وہ اسے گھسیٹے گھسیٹے کہیں اور ہی لے جا رہا تھا، اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا، سوا اس کے کہ جو میرے ساتھ پیش آ رہا ہے اسے باہر سے منفعل بیٹھا دیکھتا رہوں، یوں جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میرے بجائے میرے ملک کا جو سفر وہ کرنے والا تھا اور جو زندگی وہاں گزارنے والا تھا، ان میں ایسی اجنبیت اور سادہ لوحی تھی جنھوں نے مجھے اس دعوے پر مکملاً یقین کرنے سے باز رکھا۔ بایں ہمہ اس فنطاسیہ کی تفاصیل میں کارفرما منطق نے مجھے چونکا دیا: مجھے محسوس ہوا کہ یہ بھی ہو سکتا تھا، میری زندگی کو اس طرح بھی بسر کیا جا سکتا تھا۔ تب میں سمجھ گیا کہ پہلی بار مجھے خوجہ کی زندگی کے بارے میں کسی بہت گہری چیز کا احساس ہوا ہے، لیکن ٹھیک ابھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ پراگندہ ذہنی سے یہ سنتے ہوئے کہ اپنی پرانی دنیا میں ''میں'' کیا کروں گا، وہ دنیا جس کی اتنی مدت سے آرزو کرتا رہا ہوں، میں صرف یہی کر سکتا تھا کہ طاعون کے خوف کو بھول جاؤں۔

لیکن یہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔ اب خوجہ مجھ سے یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ جب اس کی جگہ لے لوں گا تو کیا کروں گا۔ اس اوٹ پٹانگ جسمانی انداز میں خود کو اتنی سختی سے جکڑے ہوئے، تاکہ یہ باور کر سکوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں اور یہ کہ سوجن محض ایک کیڑے کی کاٹ ہے، میرے اعصاب اس بری طرح مضمحل ہو چکے تھے کہ مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ جب اس نے اصرار کیا، مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ میں نے وطن لوٹنے پر اپنا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا: جب میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے ایک دن میں اس کے ماجرا کی ایک اچھی کہانی رقم کروں، تو اس نے مجھے سخت تنفر سے دیکھا۔ میں اسے اتنی اچھی طرح نہیں جانتا تھا جتنی اچھی طرح وہ مجھے ـــــ حقیقت تو یہ ہے کہ بالکل نہیں! مجھے دھکا دے کر دور کرنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے اکیلا کھڑا ہو گیا: جب وہ میری جگہ لے لے گا تب یہ فیصلہ کرے گا کہ مجھے کیا پیش آنا

چاہیے! اس نے کہا کہ سوجن طاعون ہی کی گلٹی ہے؛ میں مرنے والا ہوں۔ اس نے بیان کیا میں مرنے سے پہلے کتنی بھیانک اذیت سے دوچار ہوں گا؛ خوف، جس کے لیے میں تیار نہیں تھا، موت سے بدتر ہوگا۔ جب وہ بتا رہا تھا کہ مرض کے عذاب کس طرح میرا ٹینٹوا دبائیں گے، خوجہ آئینے کے چوکھٹے سے باہر نکل آیا تھا؛ جب میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنے بستر پر، جسے اس نے پھوہڑپن سے فرش پر بچھا دیا تھا، پیر پھیلائے پڑا تھا، اور ان شدید تکلیفوں کی وضاحت کر رہا تھا جو مجھے جھیلنی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت اس نے پکارا، اور جب میں، لرزہ براندام، اس کی جانب گیا، تو فوراً اس پر پچھتایا؛ اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ مجھ پر رکھنے کی کوشش کی۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو، میں نے یہی سوچا کہ وہ کیڑے کی کاٹ ہی تھی، اس کے باوجود میں خوفزدہ تھا۔

پوری رات اسی طرح گزری۔ مجھے مرض کی چھوت لگانے کی کوشش میں وہ مسلسل یہی تکرار کرتا رہا کہ میں، وہ ہوں اور وہ، میں۔ یہ وہ اس لیے کر رہا ہے کہ اسے اپنی ذات سے باہر قدم رکھنے میں لطف آتا ہے، اپنے کو فاصلے سے دیکھنے میں، میں نے خیال کیا، اور اپنے سے کہتا رہا، جیسے کوئی خواب سے جاگنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہو: یہ ایک کھیل ہے؛ کیونکہ وہ خود یہ لفظ ''کھیل'' استعمال کر رہا تھا، لیکن اسے کسی ایسے شخص کی طرح سخت پسینہ آ رہا تھا جو کسی جسمانی مرض میں مبتلا ہو، ایسے آدمی کی طرح نہیں جس کا گرم کمرے میں موذی خیالات دم گھونٹے دے رہے ہوں۔

جب سورج نکلا تو وہ ستاروں اور موت کے بارے میں بات کر رہا تھا، اپنی جھوٹی پیشین گوئیوں کے بارے میں، سلطان کی حماقت اور بدتر، اس کی ناشکری، اپنے عزیز ''احمقوں'' کے بارے میں، ''ہم'' اور ''وہ'' اس کے بارے میں کہ اسے کوئی دوسرا ہونے کی کتنی خواہش ہے۔ میں اب مزید نہیں سن رہا تھا، میں باہر باغ میں گیا۔ کسی وجہ سے میرا ذہن جاودانیت سے متعلق خیالات میں ڈوبا ہوا تھا جس کی بابت میں نے ایک قدیم کتاب میں پڑھا تھا۔ باہر کوئی حرکت نہیں تھی سوائے اس کے کہ گوریاں چہچہا رہی تھیں اور لیموں کے درختوں کی ایک شاخ

سے دوسری شاخ پر پھدکتی پھر رہی تھیں۔ سکوت کس قدر سراسیمہ کر دینے والا تھا! مجھے استنبول میں دوسرے کمروں کا خیال آیا جہاں طاعون زدہ پڑے مر رہے ہوں گے۔ اگر خوجہ کی بیماری طاعون تھی تو وہ اسی طرح جاری رہے گی تا آنکہ وہ مر نہیں جاتا، میں نے غور کیا، وہ سرخ سوجن غائب نہیں ہو جاتی۔ مجھے اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس گھر میں زیادہ عرصے نہیں رہ سکوں گا۔ جب میں اندر لوٹا تو مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ کہاں فرار کر سکتا ہوں، کہاں اپنے کو چھپاؤں گا۔ میں خوجہ سے دور کسی جگہ کا خواب دیکھ رہا تھا، طاعون سے دور۔ اپنے تھوڑے سے کپڑے ایک جھولے میں ٹھونستے ہوئے، مجھے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ جگہ کہیں قریب ہی ہوگی کہ اس تک بغیر گرفتار ہوئے پہنچ سکوں۔

(۷)

میں نے تھوڑا سا پیسہ، جو موقع ملنے پر خوجہ سے چرایا تھا، اور وہ بھی جو میں نے اِدھر اُدھر کام کر کے کمایا تھا، پس انداز کر رکھا تھا۔ گھر چھوڑنے سے پہلے میں نے صندوق سے یہ اندوختہ نکالا جسے میں نے کتابوں کے درمیان، جن پر اب وہ کبھی ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالتا تھا، ایک موزے کے اندر چھپا رکھا تھا۔ تجسس کی گرفت میں آ کر، اب میں خوجہ کے کمرے میں گیا، جہاں وہ سو چکا تھا، بری طرح پسینے میں شرابور، اور چراغ روشن تھا۔ مجھے اس پر تعجب ہوا کہ وہ آئینہ جو مجھے اِس حیرت انگیز مشابہت سے، جو پوری طرح مجھے کبھی اپنا یقین نہیں دلا سکی تھی، پوری رات ڈراتا رہا تھا اس قدر چھوٹا سا تھا۔ کسی چیز کو چھوئے بغیر، میں بڑی تیزی کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ محلے کی ویران سڑکوں پر مجھے ایک ہلکی سی ہوا چلتی محسوس ہوئی۔ ایک لہر سی اٹھی کہ اپنے ہاتھ دھوؤں، مجھے معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے، میں آسودہ خاطر تھا۔ فجر کی خاموشی میں سڑکوں پر چلتے ہوئے، پہاڑیوں سے نشیب میں سمندر کی طرف اترتے ہوئے، فوّاروں میں ہاتھ دھوتے ہوئے، گولڈن ہورن کا منظر دیکھتے ہوئے مجھے لطف آ رہا تھا۔

میں نے جزیرۂ ہَیبیلی کا ذکر پہلی بار ایک نوجوان راہب سے سنا تھا جو استنبول وہیں سے آیا تھا؛ جب گلتا کے یورپی علاقے میں ہماری ملاقات ہوئی، اس نے بڑے جوش وخروش

کے ساتھ جزائر کے حسن کا ذکر کیا۔ یقیناً میں متأثر ہوا ہوں گا کیونکہ اپنا علاقہ چھوڑتے ہی مجھے علم ہو گیا تھا کہ میں وہیں جاؤں گا۔ جن ملّاحوں اور مچھیروں سے میں نے بات کی انھوں نے جزیرے تک پہنچانے کی ناقابلِ یقین اجرت مانگی، اور مجھے یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ انھیں معلوم تھا کہ میں ایک مفرور ہوں— خوجہ جن لوگوں کو میری تلاش میں بھیجے گا یہ انھیں میرا اتا پتا بتا دیں گے! بعد میں میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا یہ طرزِ عمل ان عیسائیوں کو ڈرانے دھمکانے کی خاطر تھا جنھیں وہ طاعون سے خوفزدہ ہونے پر حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لوگوں کی توجہ میں نہ آنے کی خاطر میں نے جس دوسرے کشتی بان سے بات کی اسی سے سودا بھی کر لیا۔ وہ مضبوط آدمی نہیں تھا، اور اس نے چپّو چلانے پر کم اور طاعون کے ذکر پر، جو گناہوں کی سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا، زیادہ محنت صرف کی۔ تکمیلِ کلام کے طور پر اس نے یہ بھی بڑھا دیا کہ طاعون سے جان بچانے کے لیے جزیرے بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ جب وہ محوِ کلام تھا، مجھے احساس ہوا کہ وہ بھی اتنا ہی خائف ہے جتنا کہ میں۔ سفر میں چھ گھنٹے لگے۔

یہ بعد ہی میں ہوا کہ مجھے جزیرے پر گزارے ہوئے دن پرمسرت معلوم ہوئے۔ ایک تن تنہا یونانی مچھیرے کے گھر پر اقامت کا معاوضہ مجھے بہت کم دینا پڑا، اور میں نے حتیٰ المقدور نظروں سے دور رہنے کی کوشش کی کیونکہ میں خود کو پوری طرح محفوظ نہیں محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتا کہ خوجہ مر مرا چکا ہوگا، بعض اوقات یہ کہ وہ آدمیوں کو میرے تعاقب میں بھیجے گا۔ جزیرے پر میری طرح بہت سے عیسائی تھے جو طاعون سے امان پانے وہاں پہنچے تھے، لیکن میں ان کی توجہ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

میں ہر صبح مچھیرے کے ساتھ سمندر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ ایک مدت تک کانٹے دار برچھے سے کیکڑوں اور کیکڑوں کا شکار کرتا رہا۔ اگر موسم اتنا برا ہوتا کہ مچھلی مارنے کے قابل نہ ہوتا تو میں جزیرے میں چاروں طرف گھومتا پھرتا، اور ایسے وقت بھی آتے جب میں خانقاہ کے باغ میں جا کر بیلوں کے نیچے سکون سے سو جاتا۔ ایک سایہ دار کنج تھا جسے انجیر کے ایک درخت نے سہارا دیا ہوا تھا جہاں سے اچھے موسم میں آدمی ٹھیک آیا صوفیہ تک دیکھ سکتا تھا، میں یہاں

سائے میں بیٹھ کر استنبول کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا، اور مسلسل گھنٹوں دن سپنوں میں گم رہتا۔ ایک سپنے میں میں کشتی میں سوار جزیرے کی طرف جا رہا تھا اور کشتی کے پہلو میں تیرتی ہوئی ڈولفنس کی ہمرہی میں مجھے خوجہ دکھائی دیا، اس نے انھیں دوست بنا لیا تھا اور میری پوچھ تاچھ کر رہا تھا؛ ایک اور مرتبہ میری ماں بھی ان کے ساتھ نظر آئی جو مجھے دیر کر دینے پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ جب چہرے پر چمکتے ہوئے سورج کی تمازت سے پسینے میں شرابور میں جگ پڑتا تو پھر انھیں خوابوں میں لوٹ جانے کی خواہش کرتا، اور ایسا نہ کر سکنے پر، خود کو غور و فکر پر مجبور کرتا: کبھی میں تصور کرتا کہ خوجہ مر گیا ہے اور مجھے اس کی لاش خالی گھر میں نظر آ رہی ہے جسے میں نے چھوڑ دیا تھا۔ میں تجہیز و تکفین کے سناٹے کو محسوس کر سکتا ہوں جس میں شریک ہونے کے لیے کوئی نہیں آئے گا؛ پھر میرا خیال اس کی پیش گوئیوں کی طرف جاتا، ان پُرتفنن چیزوں کی طرف جو اس نے ہنسی خوشی اختراع کی تھیں اور وہ بھی جو اس نے بیزاری اور طیش کے عالم میں گھڑی تھیں؛ اور سلطان اور اس کے جانوروں کی طرف بھی۔ ان دن سپنوں کے ہمراہ وہ بوجھل رقص کرتے ہوئے کیکٹ اور کیکڑے بھی آتے جن کی پشت کے آر پار میں نے برچھا اتار دیا ہوتا۔

میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جلد یا بدیر میں اپنے وطن فرار ہو سکوں گا۔ بس اس جزیرے کے کھلے دروازوں سے دبے پاؤں سرک جانے کی دیر ہی تو تھی، لیکن اس سے پہلے خوجہ کو بھول جانا لازمی تھا۔ کیونکہ میں بے خبری میں اس چیز کے طلسم میں آ گیا تھا جو مجھ پر وارد ہوئی تھی، یاد کی ترغیب کے؛ میں تقریباً خود کو ایک ایسے آدمی کو اکیلا چھوڑ آنے کا قصوروار ٹھہرا رہا تھا جو شکلاً مجھ سے اس قدر ملتا جلتا تھا۔ جیسے اب، اس وقت بھی میں بڑے شدید جذبے سے اس کا آرزومند تھا؛ کیا واقعی وہ مجھ سے اتنا ہی مشابہ تھا جتنا یاد میں نظر آتا تھا یا میں اپنے کو فریب دے رہا ہوں؟ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گزشتہ گیارہ سالوں میں میں نے ایک مرتبہ بھی ٹھیک سے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا؛ حقیقت یہ ہے کہ ایسا میں نے بار بار کیا تھا۔ مجھے یہ ہڑک بھی ہوئی کہ استنبول جاؤں اور ایک آخری بار اس کے مردہ جسم کو دیکھوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر مجھے آزاد ہونا ہے تو خود کو یہ یقین دلانا ہی پڑے گا کہ ہمارے درمیان وہ پراسرار

مشابہت یادداشت کی فاش غلطی تھی، ایک تلخ فریبِ نظر جسے فراموش کر دینا ضروری ہے، اور مجھے اس حقیقت کا عادی ہو جانا چاہیے۔

خوش قسمتی سے میں اس کا عادی نہ ہوا۔ کیونکہ ایک دن میں نے اچانک خوجہ کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ میں مچھیرے کے پائیں صحن میں لیٹا دن سپنے دیکھ رہا تھا، میری بند آنکھیں سورج کی طرف تھیں کہ مجھے اس کے سایے کا احساس ہوا۔ اس کا رخ میری طرف تھا، وہ مجھے اس آدمی کی طرح دیکھ رہا تھا جسے مجھ سے محبت ہو، نا کہ اس کی طرح جس نے کسی کھیل میں مجھے شکست دی ہو۔ مجھے تحفظ کا غیر معمولی احساس ہوا، اتنا غیر معمولی کہ میں کسی خدشے سے چوکنا ہو گیا۔ شاید میں اندر اندر اسی کا انتظار کر رہا تھا، کیونکہ میں نے فوراً ایک کاہل غلام، ایک حقیر، تعظیماً سر جھکائے ملازم کے مجرمانہ محسوسات میں مراجعت کی۔ اپنا اثاثہ اکٹھا کرتے ہوئے، بجائے خوجہ سے نفرت کرنے کے، خود اپنے کو برا بھلا کہا۔ اور یہ وہ تھا جس نے مچھیرے کا جو قرضہ مجھ پر نکلتا تھا چکایا۔ وہ اپنے ساتھ دو آدمی لایا تھا اور ہم دُہرے چپّو چلاتے ہوئے بسرعت لوٹ گئے۔ رات پڑنے تک ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ مجھے گھر سے اٹھنے والی مہک کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ اور آئینہ دیوار سے اتار دیا گیا تھا۔

اگلی صبح خوجہ نے سامنے کھڑا کر کے مجھ پر الزام لگانے شروع کیے: میرا جرم بہت گھناونا تھا اور وہ مجھے سزا دینے کو بے چین تھا، بھاگ جانے ہی پر نہیں، بلکہ یہ سوچ کر کہ کیڑے کی کاٹ طاعون کی گلٹی تھی اسے اپنے بسترِ مرگ پر تنہا چھوڑ کر چلے جانے پر بھی، لیکن یہ سزا دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے وضاحتاً کہا کہ گزشتہ ہفتے سلطان نے بالآخر اسے بلوایا اور پوچھا کہ یہ طاعون کب ختم ہوگا، اور کتنی زندگیوں کی قربانی لے گا، آیا اس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔ خوجہ نے، جو بڑے جوش میں آیا ہوا تھا، گول مٹول جواب دیے کیونکہ وہ تیار نہیں تھا، اور کچھ مہلت دیے جانے کی درخواست کی کیونکہ اسے ستاروں سے رجوع جو کرنا تھا۔ وہ احساسِ فتحمندی سے باولا باولا، ناچتا ہوا گھر لوٹا تھا، لیکن اس سے لاعلم کہ سلطان کی دلچسپی کو کس طرح اپنے فائدے کے حسبِ حال بنائے۔ تو اس لیے اس نے مجھے واپس لانے کا فیصلہ کیا۔

Scanned by CamScanner

اسے ایک زمانے سے معلوم تھا کہ میں اس جزیرے پر مقیم ہوں؛ میرے رفو چکر ہونے کے بعد اسے سردی لگ گئی تھی، اور تین دن بعد وہ میری تلاش میں نکل پڑا تھا، مچھیروں سے میرا سراغ لگا لیا تھا، اور جب اس نے اپنے بٹوے کو ذرا اور وا کیا تو باتونی کشتی بان نے بتا دیا کہ وہ مجھے ہَیبیلی لے گیا تھا۔ چونکہ خوجہ کو معلوم تھا کہ میں جزائر سے آگے فرار نہیں ہو سکتا، اس نے مزید میرا تعاقب نہیں کیا۔ جب اس نے کہا کہ سلطان سے یہ ملاقات اس کی زندگی کا فیصلہ کن موقع تھی تو میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اور اس نے بے کم و کاست کہا کہ اسے میرے علم کی حاجت ہے۔

ہم نے فوراً کام شروع کر دیا۔ خوجہ کا فیصلہ کن انداز اس آدمی کا سا تھا جسے کما حقہ معلوم ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے؛ اور میں اس عزمِ صمیم پر، جو میں نے اس سے قبل مشکل ہی سے اس میں دیکھا تھا، بے حد مسرور ہوا۔ چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اگلے دن اس کی دوبارہ طلبی ہوگی، ہم نے کچھ دیر اس میں پچر لگانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اتفاق کیا کہ بہت زیادہ معلومات نہیں فراہم کرنی چاہئیں اور صرف اسی کا ذکر کرنا چاہیے جس کی تصدیق ممکن ہو۔ خوجہ کی تیز فہمی، جس کا میں اس قدر مداح تھا، اسے براہ راست اس رائے تک لے آئی تھی کہ ''پیشین گوئی مسخرا پن ہے، لیکن اسے احمقوں کو متأثر کرنے کے لیے اچھی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' مجھے بولتا سنتے وہ اس پر اتفاق کرتا ہوا لگا کہ طاعون ایک تباہی ہے جس کی روک تھام صرف تندرستی سے متعلق پیش بندیوں ہی سے کی جا سکتی ہے۔ میری طرح وہ اس کا انکاری نہیں تھا کہ یہ تباہی خدا کے ارادے سے تھی، لیکن صرف بالواسطہ طور پر ہی؛ اسی لیے ہم فانی انسان بھی اس کا جائزہ لے سکتے ہیں اور خدا کی کبریت کو مجروح کیے بغیر اپنے تحفظ کے لیے اقدامات کر سکتے ہیں۔ کیا خلیفۂ راشد عمر نے والی ابو عبیدہ کو شام سے مدینہ اس لیے نہیں بلوا لیا تھا کہ فوج کو طاعون کی زد سے بچایا جا سکے؟ خوجہ سلطان کو مشورہ دے گا کہ اپنے تحفظ کے لیے اغیار سے اپنا میل جول مطلق کم سے کم کر دے۔ یہ نہیں تھا کہ سلطان کے دل میں موت کا خوف ڈال کر اسے ان پیش بندیوں پر کاربند ہونے کا قائل کرنے کا خیال ہمیں نہیں آیا ہو، لیکن یہ ایک خطرناک بات تھی۔ یہ سلطان

کو موت کے مبالغہ آمیز بیان سے محض خوفزدہ کرنے کا معاملہ نہیں تھا؛ خوجہ کی بک بک کی اثر انگیزی سے قطعِ نظر، اس کے نزدیک احمقوں کا ایک ہجوم اس کے خوف میں شرکت اور اس پر فتح پانے میں اس کی مدد کے لیے موجود تھا۔ بعد میں یہی بے اصولے احمق خوجہ کو بے دین ہونے کا الزام دے سکتے تھے۔ چنانچہ، میرے ادبیات کے علم پر بھروسا کرتے ہوئے، ہم نے سلطان کو سنانے کے لیے ایک افسانہ گھڑا۔

جو چیز خوجہ کے لیے سب سے زیادہ حوصلہ شکن ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ طاعون کب ختم ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ ہمیں ابتدا یومیہ اموات کے اعداد و شمار سے کرنی چاہیے؛ جب میں نے خوجہ سے اس کا ذکر کیا تو وہ بہت زیادہ متأثر نہیں ہوا، بہرکیف اس نے سلطان سے اعداد و شمار کی درخواست کی حامی بھر لی لیکن کہا کے اپنی درخواست کی غرض و غایت پر پردہ پوشی کرے گا۔ ریاضی پر مجھے بہت زیادہ اعتماد نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

اگلی صبح وہ محل گیا، اور میں طاعون زدہ شہر میں۔ میں اب بھی طاعون سے اتنا ہی خائف تھا جتنا پہلے، لیکن حیاتِ روزمرہ کے پرشور اور غیر منظم تحرک، دنیا سے کچھ نہ کچھ، خواہ اس کا ادنیٰ ترین حصہ ہی کیوں نہ ہو، اینٹھ لینے کی ہمہ جا موجود جستجو نے میرا سر چکرا دیا۔ یہ گرما کا ایک ٹھنڈا، ہوادار دن تھا؛ مرے ہوؤں اور مرتے ہوؤں کے درمیان پھرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ زندگی کو اس شدت سے چاہے ہوئے مجھے کتنے سال بیت گئے ہیں۔ میں مسجدوں کے دالانوں میں گیا، ایک کاغذ پر جنازوں کی تعداد درج کی، اور مختلف محلوں سے گزرتے ہوئے جو کچھ مجھے نظر آیا اس کے اور موت کے اعداد و شمار کے درمیان کسی ربط کو قائم کرنے کی کوشش کی: تمام گھروں، لوگوں، بھیڑ بھاڑ، چمک جھمک، اندوہ اور خوشی کے درمیان کسی معنی کی تفہیم آسان نہیں تھی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ میری آنکھ اگر کسی چیز کی بھوکی تھی تو یہ صرف تفاصیل تھیں، دوسروں کی زندگیاں، اور ان لوگوں کی مسرت، بے چارگی، اور لاتعلقی تھی جو اپنے گھروں میں اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ فروکش تھے۔

دوپہر کے قریب میں گولڈن ہورن کے دوسرے کنارے جا اترا، گلتا کے اس علاقے میں جہاں یوروپی لوگ رہتے ہیں، اور بھیڑ بھاڑ اور مردہ لاشوں سے سرشار ہو کر گھٹیا سے قہوہ خانوں، گودیوں کے گردونواح میں گھومتا پھرا، جھجھکتے ہوئے تمباکو پیا، حقیر سے طعام خانوں میں کھایا پیا، محض تفہیم کی خواہش کی خاطر، بازاروں اور دکانوں میں گیا۔ میں ہر تفصیل کو اپنے ذہن پر نقش کر لینا چاہتا تھا تاکہ کسی نتیجے تک پہنچ سکوں۔ جھٹ پٹے کے بعد گھر لوٹا، تھکن سے چور چور، اور خوجہ سے محل کا ماجرا سنا۔

وہاں سب ٹھیک گزری تھی۔ ہماری گھڑنت کہانی نے سلطان کو بری طرح متأثر کیا تھا۔ اس کی عقل نے یہ بات قبول کر لی تھی کہ طاعون ایک شیطان ہے جو انسان کا روپ دھار کر اسے فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے؛ اس نے محل میں اجنبیوں کے داخلے کی ممانعت کا فیصلہ کیا؛ آمدورفت پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ جب خوجہ سے پوچھا گیا کہ کب اور کیسے طاعون ختم ہوگا، تو اس نے باتوں کا وہ طوفان اٹھا دیا کہ سلطان نے خوفزدہ ہو کر کہا کہ اسے موت کا فرشتہ عزرائیل شہر بھر میں کسی شرابی کی طرح مارا مارا پھرتا نظر آ رہا ہے، جس پر نظر جما دیتا ہے، اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لے جاتا ہے۔ خوجہ نے لپک کر اس کی تصحیح کی، یہ عزرائیل نہیں، خود سلطان ہے جو لوگوں کو بہلا پھسلا کر ان کی موت تک پہنچا دیتا ہے: اور وہ نشے میں دھت نہیں ہے بلکہ غایت درجے کا عیار ہے۔ خوجہ نے، عین ہمارے منصوبے کے مطابق، یہ بالکل واضح کر دیا تھا کہ شیطان سے جنگ آزمائی اشد ضروری ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ طاعون کب شہر سے رخصت ہوگا اس کی حرکات کا مشاہدہ ازبس ضروری ہے۔ ہرچند کہ اس کے مصاحبین میں ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا کہ طاعون سے جنگ آرائی خدا کی مخالفت کے مترادف ہے، لیکن سلطان نے اس کو بالکل لائقِ اعتنا نہ سمجھا؛ اور بعد میں اپنے جانوروں کے بارے میں استفسار کیا؛ کیا طاعون کا شیطان اس کے شِکروں کو گزند پہنچائے گا، اس کے عقابوں، شیروں، بندروں کو؟ خوجہ نے فوراً جواب دیا کہ شیطان انسانوں کے پاس انسانی روپ میں آتا ہے اور جانوروں کے پاس ایک چوہے کے روپ میں۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانچ سو بلیاں ایک دور افتادہ شہر سے لائی

جائیں جو طاعون سے پاک ہو، اور کہ خوجہ کو جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو مہیا کیے جائیں۔

ہم نے لپک جھپک وہ بارہ آدمی جو ہماری ماتحتی میں دیے گئے تھے استنبول کے چاروں کناروں میں پھیلا دیے تاکہ سارے علاقوں کا پہرہ دیں اور ہمیں اموات کا شمار بتائیں اور دیگر تمام باتوں کی اطلاع دیں جو ان کے مشاہدے میں آئیں۔ ہم نے میز پر استنبول کا جو سرسری سا نقشہ میں نے کتابوں سے دیکھ کر بنایا تھا پھیلا دیا۔ خوف اور سرخوشی سے ہم ہر شب نقشے پر ان علاقوں پر نشان لگاتے جاتے جہاں طاعون پھیلا ہوتا، اور ان نتائج کا خلاصہ تیار کرتے جو ہم سلطان کو پیش کرنے والے ہوتے۔

شروع شروع میں ہمیں خوش امیدی نہ تھی۔ طاعون کسی ہرزہ گرد کی طرح شہر میں مٹرگشت کر رہا تھا، کسی فریبی شیطان کی طرح نہیں۔ ایک دن اَکسَرَائے کے علاقے میں اس نے چالیس آدمیوں کی جان لے لی، اگلے دن فاتح پر جھپٹا مارا، ناگہانی دوسرے کنارے پر نمودار ہوا، تُوپ خانے، جہانگیر میں، اور اگلے دن جب ہم نے دوبارہ دیکھا تو اس نے ان مقامات کو بمشکل ہی چھوا تھا اور زَیرَک سے گزرتے ہوئے ہمارے علاقے میں داخل ہوا جہاں سے نشیب میں گولڈن ہورن نظر آتا تھا، اور بیس آدمی مار ڈالے۔ اموات کے اعداد سے ہماری سمجھ میں خاک نہ آیا؛ ایک دن پانچ سو جاں بحق ہوئے، اگلے دن ایک سو۔ کافی وقت برباد کرنے کے بعد احساس ہوا کہ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ طاعون نے کہاں شکار کیا ہے بلکہ یہ کہ اس کا چھوت پہلے کہاں لگا ہے۔ دریں اثنا سلطان پھر خوجہ کو طلب کر رہا تھا۔ کافی غوروخوض کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ خوجہ یہ کہے گا کہ طاعون کی گزرگاہ بھیڑ بھڑکے سے پُر مارکٹیں ہیں، بازار جہاں لوگ ایک دوسرے کو غچہ دیتے ہیں، قہوہ خانے جہاں لوگ ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھ کر غپ شپ کرتے ہیں۔ وہ رخصت ہوا، شام پڑنے پر لوٹا۔

خوجہ نے یہ سب اس سے کہہ دیا۔ ''تو ہم کیا کریں؟'' سلطان نے پوچھا۔ خوجہ نے مشورہ دیا کہ مارکٹوں میں ہونے والی آمدورفت کو بہ زورِ بازو کم کیا جائے: حاکم کے نادان مصاحبین نے فوراً اس کی مخالفت کی، ظاہر ہے: تو پھر شہر بھر میں کھانے پینے کا بندوبست کیسے

ہوگا، بیوپار بند تو زندگی بھی ختم شد، یہ خبر کہ طاعون آدمی کے بھیس میں گھومتا پھر رہا ہے اپنے سننے والوں کو خوفزدہ کردے گی، وہ سوچیں گے کہ یوم الحساب آ گیا ہے اور کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا بیٹھیں گے؛ کون چاہے گا کہ ایسے محلے میں محصور ہوجائے جس میں طاعون کا شیطان دندناتا پھر رہا ہو، وہ اچھی خاصی بغاوت کھڑی کردیں گے۔'' اور وہ اس میں بالکل حق بجانب ہوں گے،' خوجہ نے کہا۔ اُس وقت کوئی احمق پوچھ بیٹھا کہ عوام کو اس درجہ قابو میں رکھنے کے لیے حسبِ ضرورت لوگ کہاں سے آئیں گے، اور سلطان مشتعل ہوگیا؛ اس نے یہ کہہ کر سب کی سٹی گم کردی کہ اگر کسی نے اس کی طاقت میں شک کیا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اپنے طیش میں اس نے حکم صادر کیا کہ خوجہ کی سفارشوں پر عمل درآمد کیا جائے، لیکن اس کے حلقے سے رجوع کرنے سے پہلے نہیں۔ شاہی منجم صدقی افندی نے، جس کے خوجہ کے تعلق سے دانت کافی تیز تھے، یاددہانی کرائی کہ اس نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ طاعون استنبول سے کب رختِ سفر باندھے گا۔ اس بات سے خائف کہ کہیں سلطان شاہی منجم کی رائے کو خاطر میں نہ لے آئے، خوجہ نے کہا کہ وہ جب اگلی دفعہ آئے گا تو ایک تقویم بھی ساتھ لائے گا۔

ہم نے میز پر نقشے کو نشانوں اور اعداد سے بھر دیا تھا لیکن ہنوز شہر میں طاعون کی نقل و حرکت کی منطق تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تک سلطان نے ہماری امتناعی سفارشات کو عملی جامہ پہنا دیا تھا اور تین دن سے زیادہ ہورہے تھے کہ ان کا التزام کیا جارہا تھا۔ ینی چیری مارکٹوں میں داخلے کے دروازوں، شاہراہوں، بندرگاہوں پر پہرہ دے رہے تھے، مسافرین کو روک رہے تھے، ان سے پوچھ گچھ کررہے تھے: ''کون ہو تم؟ کہاں جارہے ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟'' وہ سہمے ہوئے، حیران پریشان مسافروں اور بے کار پھرنے والوں کو واپس اپنے گھر بھیج رہے تھے تاکہ طاعون کی زد میں نہ آجائیں۔ جب تک ہمیں معلوم ہوا کہ صدر بازار اور اُن کاپہ میں نقل و حرکت سرد پڑ گئی ہے، ہم بیٹھے اموات کے اعداد و شمار پر غور کررہے تھے جو ہم نے ماہِ گزشتہ میں اکھٹے کیے تھے، اور کاغذ کے پرزوں پر درج کرکے دیوار پر لگا دیے تھے۔ خوجہ کی رائے تھی کہ ہم بے کار ہی طاعون کے کسی منطق کے مطابق نقل و حرکت کرنے کے منتظر

ہیں اور اگر اپنے سروں کی جاں بخشی چاہتے ہیں تو سلطان کو پیش کرنے کے لیے کوئی بہانہ گھڑنا ناگزیر ہے۔

کم و بیش اسی وقت اجازت ناموں کا نظام بھی جاری کیا گیا۔ ینی چریوں کے آغا نے ان لوگوں میں اجازت نامے تقسیم کیے جو کاروباری امور کی بجا آوری کے لیے ضروری خیال کیے جاتے تھے کہ کام جاری رکھیں اور شہر کو غذا بہم پہنچائیں۔ جب مجھے اموات کے اعداد میں پہلی بار ایک خاص قرینہ نظر آنا شروع ہوا تو ہمیں پتا چلا کہ آغا اس دھندے سے کافی پیسہ بٹور رہا ہے، اور چھوٹے بیوپاری، جو پیسہ دینے پر راضی نہیں تھے، بغاوت کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ جب خوجہ کہہ رہا تھا کہ وزیرِ اعظم کپرولو چھوٹے تاجروں کے ساتھ مل کر ایک بغاوت کا منصوبہ بنا رہا ہے، تو میں نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے اسے اس مخصوص قرینے سے متنبہ کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ طاعون بیرونی محلوں اور تنگ حال علاقوں سے بتدریج اٹھتا جارہا ہے۔

میری بات سے وہ پوری طرح قائل نہیں ہوا، لیکن تقویم کی تشکیل کا کام میرے سپرد کردیا۔ بولا کہ سلطان کی توجہ بٹانے کے لیے اس نے ایک کہانی لکھی ہے جو اتنی لایعنی ہے کہ کوئی بھی اس سے کسی قسم کا نتیجہ نہیں نکال سکے گا۔ چند دن بعد اس نے پوچھا کہ کیا ایسی کہانی وضع کرنا ممکن ہے جس کا سوائے پڑھنے اور سننے کے لطف کے کوئی اور اخلاقی سبق یا مطلب نہ ہو۔ ''جیسے موسیقی؟'' میں نے تجویز پیش کی، اور خوجہ الجھن میں پڑ گیا۔ ہم نے اس پر بحث کی کہ مثالی کہانی کو کس طرح ایک معصوم پریوں کی کہانی کی طرح شروع ہونا چاہیے، اپنے وسط میں کسی ڈراؤنے خواب کی طرح مہیب ہونا چاہیے، اور اس کا اختتام کسی ہجر و فراق پر ختم ہونے والی عشقیہ کہانی کی طرح درد انگیز ہونا چاہیے۔ اس کے محل جانے سے پچھلی رات کو ہم دیر تک بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے اور جلد بازی سے کام کیا۔ دوسرے کمرے میں ہمارا چپ دست کاتب دوست اس کہانی کی شروعات کا مبیضہ تیار کرتا رہا جسے خوجہ ہنوز تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔ صبح کے قریب، ان محدود اعداد و شمار کو بروئے کار لاتے ہوئے جو مجھے دستیاب تھے، میں نے ان مساواتِ جبریہ (equations) سے، جن کو بنانے کی میں دنوں جدوجہد کرتا رہا تھا،

ہماراواٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زیل میں ہیں

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شان دار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارے واٹس ایپ گروپ میں شامل ہونے کے لیے

محمد ذولقرنین حیدر 03123050300

پروفیسر سدرہ ریاض صاحبہ 03340120123

محمد ثاقب ریاض 03447227224

یہ نتیجہ نکالا کہ طاعون اپنے آخری شکار مارکٹوں میں کرے گا اور بیس دن کے اندر اندر شہر چھوڑ دے گا۔ خوجہ نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ نتائج میں نے کن بنیادوں پر قائم کیے ہیں، اور صرف یہ جملہ تراشتے ہوئے کہ یومِ نجات بہت دور ہے ہدایت کی کہ میں دو ہفتوں کے حساب سے تقویم پر نظرِ ثانی کروں اور اس مدت کو دوسرے اعداد میں خلط ملط کردوں۔ مجھے اس میں کامیابی پر شک تھا، لیکن جو اس نے کہا تھا کردیا۔ چند تاریخوں کی رعایت سے خوجہ نے جھٹ پٹ شعری مادہ ہائے تاریخ نکالے اور کاتب کے ہاتھ میں ٹھونس دیے جو بس اب اپنا کام ختم کرنے ہی والا تھا؛ اس نے مجھے حکم دیا کہ مختلف شعروں کے لیے وضاحتی تصویریں بناؤں۔ دوپہر آتے آتے، چڑچڑا، مایوس، اور خوفزدہ، اس نے مقالے کو ابری دار غلافوں میں باندھا اور اسے لے کر روانہ ہوا۔ بولا کہ اسے تقویم پر ان پیلیکنس، پردار بیلوں، سرخ چیونٹیوں اور ناطق بندروں سے بھی کم تر یقین ہے جنھیں اس نے اپنی کہانی میں ٹھونسا ہے۔

جب وہ شام کو لوٹا تو خوشی سے باغ باغ تھا، اور یہ سرخوشی ان تین ہفتوں حاوی رہی جن کے دوران اس نے سلطان کو وافی وشافی طور پر اپنی پیش گوئی کی صحت کا قائل کردیا: آغاز میں اس نے کہا تھا، ''کچھ بھی ہوسکتا ہے،'' پہلے دن وہ بالکل پرامید نہیں تھا: سلطان کے گرد جن لوگوں کا جمگھٹا تھا ان میں سے بعضے تو ایک خوش لحن بچے کی زبانی اس کی کہانی کو سنتے ہوئے ہنس بھی دیے تھے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ انھوں نے خوجہ کی تحقیر کے لیے کیا تھا، سلطان کی عنایات سے اس کو محروم کرنے کے لیے، لیکن حاکم نے خاموشی کا مطالبہ کیا اور ان کی سرزنش کی؛ اس نے خوجہ سے صرف یہی پوچھا کہ اس نے کن نشانیوں کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دو ہفتوں کے اندر اندر طاعون کا خاتمہ ہوجائے گا۔ خوجہ بولا کہ یہ سب کچھ کہانی میں شامل ہے، جس کی تفہیم سے ہر کس قاصر رہا ہے۔ پھر، سلطان کو خوش کرنے کے لیے، اس نے بھانت بھانت کے رنگوں والی بلیوں سے موانست کا دکھاوا کیا جو ترابزون سے جہاز پر لائی گئی تھیں اور اب محل کے سارے دالانوں اور کمروں میں ہجوم کررہی تھیں۔

اس نے کہا کہ دوسرے دن اس کی آمد پر محل دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا؛ ایک گروہ، جس

میں شاہی منجم صدقی افندی شامل تھا، ان تمام حفاظتی تدابیر کو جو شہر پر لاگو کی گئی تھیں ہٹانے کے حق میں تھا؛ جب کہ دوسرے جو خوجہ کی حمایت کررہے تھے، بولے، ''شہر کو سانس لینے کی اجازت بھی نہیں ملنی چاہیے، طاعون کے شیطان کو سانس کے ساتھ بھی اندر داخل نہ ہونے دینا چاہیے۔'' اموات کے اعداد کو دن بدن کم ہوتے دیکھ کر میں پرامید تھا، لیکن خوجہ ہنوز متفکر، کیونکہ یہ بات سرگوشیوں میں سنی جارہی تھی کہ پہلے گروہ نے، گیرُ ولو کے ساتھ سمجھوتا کرکے، بغاوت کی تیاریاں شروع کردی ہیں؛ ان کا مقصد طاعون کو فتح کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے حریفوں سے نجات پانا۔

پہلے ہفتے کے اختتام پر اموات کے اعداد میں بیّن تخفیف نظر آرہی تھی، لیکن میرے حساب کتاب سے عیاں تھا کہ وبا محض ایک اور ہفتے میں ٹلنے والی نہیں تھی۔ میں نے خوجہ سے میری تقویم میں ہیر پھیر کرنے کی شکایت کی، لیکن اب وہ خود پرامید تھا؛ اس نے بڑے جوش کے عالم میں مجھ سے کہا کہ وزیر اعلیٰ کی بابت وہ کانا پھونسیاں اب سننے میں نہیں آرہیں۔ مستزاد یہ کہ خوجہ کی حمایتی جماعت نے یہ خبر پھیلادی ہے کہ گیرُ ولو ان کے ساتھ سازباز کررہا ہے۔ جہاں تک سلطان کا تعلق ہے، وہ ان تمام ریشہ دوانیوں سے بری طرح خائف ہوکر اپنی بلیوں میں اپنے ذہنی سکون کا متلاشی ہے۔

دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے شہر کا دم طاعون کے مقابلے میں ان حفاظتی تدابیر سے زیادہ گھٹا جارہا تھا؛ ہر گزرتے دن کے ساتھ کم سے کم لوگ مر رہے تھے، لیکن اس کا احساس صرف ہمیں تھا یا ہم جیسے دوسروں کو جو مرنے والوں کا شمار کررہے تھے۔ قحط پڑنے کی افواہیں اڑنے لگی تھیں، استنبولِ قوی ایک اجڑے ہوئے شہر کی طرح ہوگیا؛ یہ سب مجھے خوجہ نے بتایا، کیونکہ میں محلے کے باہر ہی نہیں نکلتا تھا: ان تمام بند کھڑکیوں اور صحنوں کے پھاٹکوں کے پیچھے ان لوگوں کی بے بسی کو محسوس کرسکتا تھا طاعون جن کا دم گھونٹے دے رہا ہو، جو طاعون اور موت سے وقتی آرام مل جانے کے منتظر ہوں۔ محل بھی امید وبیم کے عالم میں تھا، اگر کبھی ایک پیالی بھی زمین پر گرجاتی یا کوئی زور سے کھانستا، لال بجھکڑوں کے ایک پورے ہجوم کے مثانے پیش قیاسی سے

پھٹ پڑتے، سب کے سب فوراً سرگوشیوں میں کہتے، ''دیکھیں سلطان آج کیا فیصلہ کرتا ہے،'' ان تمام بے چاری روحوں کی طرح شدید جذباتی ہیجان کے عالم میں جو کچھ ہو رہنے کو بے تاب ہوں، خواہ یہ کچھ بھی ہو۔ اس تمام اضطراب سے خوجہ بڑی بری طرح متأثر ہوا؛ اس نے سلطان کو ٹھیک سے بتانے کی کوشش کی کہ طاعون رفتہ رفتہ اتر رہا ہے، کہ اس کی پیش گوئیاں درست ثابت ہوئی ہیں، لیکن وہ اس کو متأثر کرنے میں ناکام رہا، اور آخراً جانوروں کے بارے میں گفتگو کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

دو دن بعد مسجدوں سے حاصل کیے جانے والے اعداد و شمار کی بنیاد پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے کے قابل ہو گیا کہ طاعون پورے طور پر سمٹ گیا ہے، لیکن اس جمعہ کے دن خوجہ کی مسرت کچھ اس وجہ سے زیادہ تھی کہ مایوس ہوتے ہوئے بیوپاریوں میں کی ایک جماعت شاہراہوں پر پہرہ دینے والے ینی چریوں سے دو دو ہاتھ کر بیٹھی تھی، اور کہ ینی چریوں کا ایک اور گروہ جو ان امتناعی اقدامات سے غیر مطمئن تھا مسجدوں میں واعظ دینے والے دو ایک گھامڑ اماموں سے جا ملا تھا، چند آواروں سے جو لوٹ کھسوٹ کے واسطے بے تاب تھے اور دیگر نکموں سے جن کی دانست میں طاعون خدا کے ارادے سے تھا اور کسی کو اس میں خلل انداز ہونے کا اختیار نہیں تھا۔ لیکن اس ابتری کو بے قابو ہونے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔ شیخ الاسلام سے فتویٰ ملتے ہی بیس آدمیوں کو فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، شاید ان واقعات کو اپنی اہمیت سے زیادہ یادگاری بنانے کے لیے۔ خوجہ کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

اگلی شام اس نے اپنی فتح کا ڈنکا بجا دیا۔ اب محل میں کسی کی مجال نہیں رہی تھی کہ حفاظتی اقدامات کے خلاف چوں بھی کر سکے؛ جب ینی چری کے آغا کو بلوایا گیا، تو اس نے محل کے باغی حامیوں کی نشاندہی کر دی؛ سلطان طیش میں آ گیا؛ وہ جماعت جس کی عداوت نے کچھ وقت کے لیے خوجہ کی زندگی اجیرن کر دی تھی تیتروں کے غول کی طرح تتر بتر ہو گئی۔ ایک وقت تک یہ سرگوشیاں ہوتی رہیں کہ کپرُ ولو ان باغیوں کے خلاف سخت اقدامات کرے گا جن کے ساتھ، عام خیال کے مطابق، اس نے خفیہ تعاون کیا تھا۔ بالکل واضح مسرت کے ساتھ خوجہ نے اعلان کیا

کہ اس معاملے میں بھی وہ سلطان پر اثر انداز ہوا ہے۔ جنھوں نے بغاوت فرو کی تھی وہ سلطان کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ طاعون بیٹھ گیا ہے۔ اور ان کا کہا درست بھی تھا۔ سلطان نے خوجہ کی اتنی تعریف کی کہ پہلے کبھی نہیں کی تھی؛ وہ اسے اپنے بندر دکھانے لے گیا جو افریقا سے پنجرے میں لائے گئے تھے جو خاص اس نے حکم دے کر بنوایا تھا۔ جب دونوں بندروں کو دیکھ رہے تھے، جن کی غلاظت اور بے شرمی نے خوجہ کو متنفر کر دیا تھا، حاکم نے پوچھا آیا وہ توتوں کی طرح بولنا سیکھ سکتے ہیں۔ اپنے مصاحبین کی طرف رخ کر کے سلطان نے بالجبر کہا کہ وہ مستقبل میں خوجہ کو کثرت سے اپنے پہلو میں دیکھنے کا خواہاں ہے، جو تقویم اس نے مرتب کی تھی وہ حرف بہ حرف صادق آئی ہے۔

مہینہ بھر بعد ایک جمعے کے دن خوجہ کو شاہی منجم مقرر کر دیا گیا؛ اس نے اس سے بھی زیادہ بڑا مرتبہ پایا: جب سلطان نمازِ جمعہ ادا کرنے مسجدِ آیا صوفیہ گیا، جس میں پورا شہر طاعون کے رخصت ہونے کی خوشی منانے اُمڈ آیا تھا، تو خوجہ کا مقام عین اس کے پیچھے تھا؛ حفاظتی اقدامات اٹھا لیے گئے تھے، اور شادمانی کا جشن منانے والوں کے ہجوم میں میں خود بھی خدا اور سلطان کا شکر بجا لانے کو موجود تھا۔ جب سلطان گھوڑے پر سوار ہمارے سامنے سے گزرا، عوام الناس پورے زور سے نعرے لگانے لگے؛ وہ وجد میں آ گئے، بڑی دھکم پیل ہوئی، ہجوم ایک موج کی طرح اُمڈا اور یانی چری نے ہمیں بہ زور پیچھے دھکیل دیا، ایک لمحے کے لیے میں ایک درخت اور اُمڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان بھنچ کر رہ گیا، اور جب کہنیوں سے دھکم دھکا کر کے میں کسی نہ کسی طرح آگے نکل آیا، تو خود کو خوجہ کے عین روبرو پایا، جو مجھ سے کوئی چار پانچ قدم کی دوری پر چل رہا تھا اور مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے میری طرف سے رخ پھیر لیا جیسے مجھے جانتا ہی نہ ہو۔ اس ناقابلِ بیان شور و غوغا میں، ناگہانی، جوش و خروش کی اس عام کیفیت سے احمقانہ طور پر متأثر ہو کر، میں نے یہ تصور کر لیا تھا کہ خوجہ نے اس لمحے مجھے نہیں دیکھا تھا، کہ اگر میں اپنی پوری قوت سے اسے پکاروں تو وہ میری موجودگی سے آگاہ ہو جائے گا اور مجھے اس بے اماں جم غفیر سے نجات دلا دے گا، یوں میں ان لوگوں کے پر مسرت جلوس میں شامل

ہوجاؤں گا جن کے ہاتھوں میں زمامِ فتح واقتدار ہے! یہ بات نہیں تھی کہ میں فتحمندی میں اپنے حصے کا طلب گار تھا یا اپنی کارکردگی پر کسی انعام کا خواہاں؛ میرا احساس بالکل دوسری نوعیت کا تھا: مجھے اس کے پہلو میں ہونا چاہیے، کیونکہ میں خود خوجہ کی ذات ہی تھا! میں اپنی ذات سے جدا ہوگیا تھا اور اسے باہر سے مشاہدہ کررہا تھا، ٹھیک ان ڈراؤنے خوابوں کی طرح جو مجھے اکثر نظر آتے تھے۔ مجھے تو اِس دوسرے آدمی کی شناخت کی کوئی حاجت ہی نہیں تھی میں جس کے اندر تھا؛ اپنی ذات کو بغیر اپنے کو پہچانے گزرتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے دیکھتے وقت میں صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے اس سے جا ملوں۔ لیکن ایک وحشی سپاہی نے مجھے اپنے پوری قوت کے ساتھ واپس ہجوم میں دھکیل دیا۔

(۸)

طاعون کا زور ٹوٹنے کے بعد کے چند ہفتوں میں نہ صرف یہ کہ خوجہ کو شاہی نجومی کا رتبہ دے دیا گیا بلکہ اس نے سلطان سے اتنا قریبی تعلق بھی پیدا کرلیا کہ ہم جس کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتے تھے: اس چھوٹی موٹی بغاوت کی ناکامی کے بعد وزیرِ اعلیٰ نے حاکم کی والدہ کو اس پر راضی کرلیا تھا کہ اس کے بیٹے کو ان جغادریوں سے نجات دلائی جائے جو اس نے اپنے اردگرد جمع کرر کھے تھے؛ کیونکہ تاجروں اور ینی چری دونوں ہی کا خیال تھا کہ لال بجھکڑوں کا یہی ہجوم، جس نے سلطان کو اپنی نکمی مہملیات سے گمراہ کیا ہے، ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ جب سابقہ شاہی منجم صدقی افندی کے آدمیوں کو، جس کے بارے میں یہ اشتباہ کیا جاتا تھا کہ سازش میں اس کا ہاتھ بھی شامل رہا ہے، محل سے نکال دیا گیا اور جلاوطن کردیا یا دوسرے عہدوں پر لگا دیا گیا، تو ان کے فرائضِ منصبی بھی خوجہ ہی کے سر آن پڑے۔

اب وہ روز ہی کسی نے کسی محل میں، جہاں سلطان متمکن ہوتا، جانے لگا، اور ان اوقات میں جو سلطان نے اس کے ساتھ گفت وشنید کے لیے مخصوص کیے ہوتے اس سے تبادلۂ خیالات کرتا۔ جب خوجہ گھر لوٹتا تو، شاداں وظفرمند، مجھے بتاتا کہ ہر صبح کس طرح سلطان پہلے پہل اس سے اپنے گزشتہ رات کے خواب کی تعبیر کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اور ان تمام فرائض

کے مقابلے میں جو اس کے ذمے تھے یہ اس کا سب سے زیادہ من بھاتا کام ہے: جب سلطان نے ایک صبح افسردگی کے ساتھ اعتراف کیا کہ پچھلی رات اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا، تو خوجہ نے کسی اور کے خواب کی تعبیر پیش کرنے کی پیشکش کی، اور جب حاکم نے بڑی گرمجوشی سے ہاں کردی تو شاہی نگراں دوڑے دوڑے گئے اور کسی شخص کو جس نے رات کو اچھی طرح خواب دیکھا تھا حاکم کے حضور لے آئے، اور یوں ہر صبح ایک خواب کی تعبیر بیان کرنے کی دیرپا رسم کی داغ بیل پڑی۔ بقیہ وقت میں دونوں باغوں میں ارغوان اور چیڑ کے بڑے بڑے درختوں کے سائے میں چہل قدمی، یا باسفورس میں ڈونگیوں میں سیر کرتے ہوئے سلطان کے پیارے جانوروں اور، ظاہر ہے، اس مخلوق کے بارے میں جسے ہم نے اپنے تخیل میں جنم دیا تھا باتیں کرتے۔ لیکن وہ سلطان کے سامنے دیگر موضوعات بھی چھیڑتا رہا تھا، جو اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مجھ سے بیان کیے: باسفورس کی داخلی لہروں کی وجہ کیا ہے؟ چیونٹیوں کی باقاعدہ عادات سے کیا کارآمد علم حاصل کیا جاسکتا ہے؟ مقناطیس میں قوتِ جذب اگر خدا کی جانب سے نہیں تو پھر کہاں سے آتی ہے؟ ستاروں کے یہاں وہاں ہونے کی کیا اہمیت ہے؟ کفار کے رسم ورواج مین کفر کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے، کوئی چیز جو جاننے کے قابل ہو؟ کیا ایسا ہتھیار ایجاد ہوسکتا ہے جو ان کے لشکروں میں خوف و ہراس پھیلا کر انھیں تتر بتر کردے؟ مجھے یہ بتانے کے بعد کہ سلطان نے کس قدر غور کے ساتھ اس کی باتوں کو سنا، خوجہ لپک کر میز پر جاتا اور وزنی، گراں قیمت کاغذ پر اس ہتھیار کے خاکے بنانے لگتا: لمبی لمبی نالیوں والی توپ، گولہ باری کرنے کے مشینی نظام جو ازخود دھماکہ کرسکیں، جنگ کے انجن، بھوت پریت جو شیطانی جانوروں کی طرف دھیان کو لے جائیں، پھر مجھے میز پر بلا کے ان پیکروں کے تشدد کے مشاہدے کی دعوت دیتا جو اس کے قول کے مطابق جلد ہی معرضِ وجود میں آنے والے تھے۔

اس کے باوجود میں خوجہ کے ساتھ ان خوابوں میں شریک ہونے کا خواہشمند تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ میرا ذہن ہنوز طاعون کے گرد منڈلا رہا تھا جس نے ہمیں اخوت کے ان دنوں کا تجربہ کروایا تھا۔ شیطان طاعون سے گلوخلاصی کے شکرانے کی نماز آیا صوفیہ میں پورے استنبول

نے ادا کی تھی، لیکن بیماری ابھی تک شہر سے مکملاً رخصت نہیں ہوئی تھی، صبح کو، جب خوجہ بہ عجلت سلطان کے محل کی جانب نکل پڑتا، میں تشویش کے عالم میں شہر بھر میں گھومتا پھرتا، تجہیز و تکفین کی رسوم کا شمار رکھتا جو محلے کی کوتاہ قامت میناروں والی مسجدوں میں اب بھی منعقد ہورہی ہوتیں، وہ چھوٹی چھوٹی نادار سی مسجدیں جن کی سرخ ٹائل کی چھتیں کائی سے اَٹی تھیں، جو خدا جانے کن محرکات کی بنا پر اس امید میں ڈوبی ہوتیں کہ بیماری شہر اور ہمیں چھوڑ کر رخصت نہ ہو۔

جب خوجہ سلطان پر اثر انداز ہونے کا ذکر کررہا ہوتا، اپنی فتح کا، میں اسے بتاتا کہ وبا ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے اور چونکہ امتناعی پابندیاں ہٹا لی گئی ہیں، کسی دن بھی عود کر آسکتی ہے۔ وہ مجھے بپھر کر خاموش کردیتا، اس دعوے کے ساتھ کہ میں اس کی کامیابیوں سے جلتا ہوں۔ میں اس کا نکتہ سمجھ گیا: وہ اب شاہی منجم تھا، سلطان اپنے خواب اس سے ہر صبح بیان کرتا تھا، وہ تخلیے میں سلطان کو اس کے ان احمقوں کے مجمعے سے الگ تھلگ اپنی بات سنا سکتا تھا، یہ وہ باتیں تھیں جن کے ہم پندرہ سال سے منتظر رہے تھے۔ یقیناً یہ ایک کامیابی تھی؛ لیکن وہ کیوں اس انداز میں کامیابی کا ذکر کررہا تھا گویا یہ تنہا اسی کی ہو؟ وہ بھول گیا تھا کہ طاعون کے خلاف اقدامات میں نے ہی تجویز کیے تھے، میں نے ہی وہ تقویم تیار کی تھی جو حرف بہ حرف درست ثابت نہ بھی ہوئی ہو لیکن اس طرح قبول ضرور کرلی گئی تھی؛ اس سے بھی کہیں زیادہ مین نے اس بات کا برا منایا کہ اسے صرف یہی یاد رہا تھا کہ میں جزیرے فرار ہوگیا تھا، لیکن وہ حالات نہیں جن کی بنا پر وہ مجھے بہ عجلت وہاں سے واپس لے آیا تھا۔

شاید وہ صحیح تھا، شاید جو میں محسوس کررہا تھا اسے حسد کہا جاسکتا ہو، لیکن اس نے یہ نہیں خیال کیا کہ یہ برادرانہ احساس تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ سمجھ لے، لیکن جب میں نے اسے یاد دلانا چاہا کہ طاعون پھیلنے سے پہلے کے دنوں میں ہم کس طرح دو غیر شادی شدہ جوانوں کی طرح میز کے دونوں سروں پر بیٹھ کر اجاڑ راتوں کی اکتاہٹ کو بھلا دینے کی کوشش کرتے تھے، جب میں نے اس کی یاددہانی کرانی چاہی کہ کس طرح بعض موقعوں پر ہم خوفزدہ ہوتے تھے تاہم ہم نے ان خوفوں سے کتنا کچھ سیکھا تھا، اور یہ اعتراف کیا کہ جزیرے پر جب میں تن تنہا تھا تو

کس شدت سے میں نے ان راتوں کی کمی محسوس کی تھی، تو اس نے یہ سب بڑے توہین آمیز انداز میں سنا گویا وہ محض میری ریاکاری کو کسی ایسے کھیل میں ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہو جس میں اس نے کوئی حصہ نہیں لیا ہو، اس نے مجھے کوئی امید نہ دلائی، اس نے اشارتاً بھی یہ نہیں کہا کہ ہم ان دنوں کی طرف لوٹیں گے جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔

ایک سے دوسرے علاقے میں مٹر گشت کرتے ہوئے میں اب یہ دیکھ سکتا تھا کہ پابندیاں ہٹا دی جانے کے باوجود طاعون، گویا یہ نہیں چاہتا ہو کہ اس چیز پر جسے خوجہ ''فتح'' کہتا تھا اپنا تاریک سایہ ڈالے، شہر سے بتدریج پیچھے ہٹ رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے اس پر حیرت ہوتی کہ ہمارے درمیان سے موت کے تاریک خوف کے اٹھنے اور چلے جانے کے خیال سے آخر کیوں میں خود کو اتنا اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا کہ ہم دونوں بات چیت کریں، سلطان کے خوابوں یا ان منصوبوں کے بارے میں نہیں جو خوجہ اس سے بیان کرتا تھا، بلکہ باہم گزارے ہوئے اپنے اگلے دنوں کے بارے میں: ایک مدت سے میں اس کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کے لیے تیار تھا، موت کے خوف کے باوجود، حتیٰ کہ اس ہیبت ناک آئینے کے سامنے بھی جو اس نے دیوار سے اتار دیا تھا۔ لیکن ادھر ایک زمانے سے خوجہ میرے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنے لگا تھا، یا کم از کم دکھاوے کے طور پر؛ بدتر یہ کہ بعض اوقات تو مجھے یہ یقین ہونے لگتا کہ وہ اس کی زحمت بھی اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں۔

جب تب، اس کو ہماری سابقہ پرمسرت زندگی کی طرف لوٹا لانے کے لیے، میں اس سے کہتا کہ ہمارا میز پر دوبارہ بیٹھنے کا وقت آ گیا ہے۔ مثال قائم کرنے کی خاطر، میں نے دو ایک بار لکھنے کو کوشش بھی کی؛ جب میں نے اسے طاعون کی دہشت کے مبالغہ آمیز بیان، خوف کی زائیدہ کسی شر کے ارتکاب کی وہ خواہش، اپنے معاصی کا بیان جو ادھورا ہی رہ گیا تھا، سے لبریز اپنے صفحات پڑھ کر سنائے، تو اس نے سننے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی، الٹے تمسخر سے کہا، ایک ایسی قوت کے ساتھ جو اس نے اپنی کامرانی سے زیادہ شاید میری بے چارگی سے اخذ کی تھی، کہ اسے اس وقت بھی یہ معلوم تھا کہ ہمارا نوشتہ لغویت سے زیادہ نہیں، اس وقت یہ کھیل

اس نے اکتاہٹ کی وجہ سے کھیلے تھے، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کہاں جا کر ختم ہوں گے، اور اس لیے بھی کہ وہ میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ میں ایک گناہ گار تھا! آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں؛ نیکوکار جیسا کہ وہ ہے اور مجرم جیسا کہ میں ہوں۔

میں نے اس کے ان الفاظ کا کوئی جواب نہیں دیا، جنھیں میں نے فتح کے خمار پر محمول کیا۔ میرا ذہن اب بھی اتنا ہی زیرک تھا جتنا پہلے، اور جب میں ہیچ باتوں پر خود کو مشتعل ہوتے دیکھتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ میں نے طیش میں آنے کی اپنی صلاحیت کھو نہیں دی ہے، لیکن میں ایسا ضرور ظاہر ہوتا جیسے یہ نہ جانتا ہوں کہ اس کے اکسانے کا جواب کیسے دوں، یا اسے کیسے شہ دوں، یا اسے کیسے زیرِ دام لاؤں۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دن جو میں نے اس سے مفرور جزیرۂ حیبلی میں گزرے تھے ان میں میں اپنے مقصد کو بھول بیٹھا تھا۔ اگر وَینس واپس پہنچ بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ پندرہ برسوں بعد میں نے عرصہ ہوا کہ یہ باور کر لیا تھا کہ میری ماں مر مرا چکی ہوگی، میری منگیتر میرے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی، اس نے شادی رچا لی ہوگی، اب اس کا اپنا کنبہ کٹم ہوگا؛ میں ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا، وہ میرے خوابوں میں بھی کم سے کم آنے لگے تھے؛ علاوہ بریں، اپنے اولین سالوں کے برخلاف میں خود کو وَینس میں ان کی معیت میں اب اور نہیں دیکھتا تھا، بلکہ انھیں خواب میں استنبول میں، ہمارے درمیان اقامت گزیں پاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وَینس لوٹ بھی گیا تو اپنی زندگی کا آغاز وہاں سے نہیں کر سکوں گا جہاں وہ مجھ سے چھوٹ گئی تھی۔ بہت سے بہت تو کوئی دوسری زندگی ازسرِنو شروع کر سکوں گا۔ اُس سابقہ زندگی کی تفاصیل کے بارے میں مجھے کوئی جوش و خروش نہیں محسوس ہوتا تھا، سوائے ترکوں اور اپنی غلامی کے سالوں کی بابت ایک دو کتابوں کی خاطر جن کو لکھنے کا کبھی منصوبہ بنایا تھا۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ خوجہ میرے ساتھ حقارت سے شاید اس لیے پیش آتا ہے کہ اسے معلوم ہے میں بے وطن اور بے مقصد ہوں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں کمزور ہوں، اور بعض اوقات مجھے اس کے یہ جاننے کی بابت بھی شک ہوتا۔ ہر روز وہ سلطان کو جو کہانیاں سنائی

ہوتیں ان سے، اور اس ناقابلِ یقین ہتھیار کے پیکر اور اس کی کامیابی سے جو وہ خواب میں دیکھتا اور کہتا کہ یہ سلطان کا دل ضرور جیت لیں گے، اس قدر نشے میں ہوتا کہ میرے خیالات کا شاید احساس تک نہ کرتا۔ میں خود کو خوجہ کی اس مطلقاً اپنے میں مگن آسودگی کو رشک سے دیکھتے ہوئے پکڑتا۔ مجھے اس سے محبت تھی، مجھے اس غیر حقیقی سرشاری سے جو اسے اپنے مبالغہ آمیز احساسِ فتح سے حاصل ہوتی تھی، غیر مختتم منصوبوں سے، اور اس کے یہ کہنے کے انداز سے کہ کوئی دم جاتا ہے وہ سلطان کو شیشے میں اتار لے گا، محبت تھی۔ میں نے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا ہوتا، خود اپنے سے بھی نہیں، کہ ایسے ہی خیالات مجھے بھی آتے تھے، لیکن جب میں اس کی حرکات کا تعاقب کرتا، اس کے روزمرہ کے افعال کا، تو اس احساس سے مغلوب ہو جاتا کہ میں خود اپنا ہی مشاہدہ کر رہا ہوں۔ کسی طفل، کسی نوجوان کو دیکھتے ہوئے، آدمی کو کبھی خود اپنی طفولیت اور شباب نظر آتا ہے، اور وہ اسے محبت اور تجسس سے دیکھتا ہے: مجھے محسوس ہونے والا خوف اور تجسس بھی اسی نوعیت کا تھا؛ مجھے اکثر یاد آتا کہ اس نے کس طرح میری گدی دباتے ہوئے کہا تھا، ''میں، تم بن گیا ہوں،'' لیکن جب میں نے اسے وہ دن یاد دلائے، تو خوجہ میری بات کاٹ کر ان سب باتوں کا ورد شروع کر دیتا جو اس دن اس نے سلطان سے اس ناقابلِ یقین ہتھیار پر یقین کرا لینے کے لیے کہی ہوتیں، یا تفصیل سے یہ بتانے لگتا کہ اس صبح اس نے حاکم کے خواب کی تعبیر کرتے ہوئے کس طرح اس کے ذہن کو رغبت دلائی۔

میں خود بھی ان کامیابیوں کی زیرکی پر یقین کر لینا چاہتا تھا جو اس کے بیان میں اس قدر شیریں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی یوں ہوتا کہ، اپنی شترِ بے مہار فسوں کاریوں کے بہاؤ میں، میں خوشی خوشی اس کی جگہ لے لیتا اور ان پر، فی الواقع، یقین کرنے لگتا۔ پھر میں اس سے اور اپنے سے محبت کرنے لگتا، ہم دونوں سے، اور کسی سادہ لوح کی طرح جس کا منھ پریوں کی کسی ہوش ربا کہانی کو سنتے وقت کھلا کا کھلا رہ گیا ہو، جو وہ کہہ رہا ہوتا اسے سننے میں مستغرق، میں یہ یقین کرنے لگتا کہ وہ ان آنے والے دنوں کا جو دنگ کر دینے والے تھے ایسے مقصد کے طور پر ذکر کر رہا ہے جس کا تعاقب ہم ساتھ ساتھ کریں گے۔

تو اس طرح میں سلطان کے خوابوں کی تعبیر کرنے میں اس کا شریک بنا۔ خوجہ نے اکیس سالہ حاکم کو حکومت پر اپنا زیادہ سے زیادہ تسلط جمانے پر اکسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان اکیلے گھوڑوں کی جو اسے اکثر اپنے خوابوں میں دیوانہ وار سرپٹ دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے یہ تفسیر کی کہ وہ اداس ہیں کیونکہ ان پر کوئی سوار نہیں؛ اور یہ کہ وہ بھیڑیے جنھوں نے اپنے شکار کے حلقوم میں اپنے دانت گڑوے ہوئے تھے، خوش ہیں کیونکہ خود کفیل ہیں؛ کہ گریہ کناں بوڑھی عورتیں اور حسین نابینا لڑکیاں اور درخت جو سیاہ بارشوں میں اپنے پتوں سے ننگے ہو گئے تھے اسے مدد کے لیے پکار رہے تھے؛ کہ مقدس عنکبوت اور پُر غرور شکرے خود مختاری کے گنوں کا علم ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ سلطان اپنی حکومت پر قبضہ جمانے کے بعد ہماری سائنس میں دلچسپی لے؛ اور اس مقصد کے واسطے ہم نے اس کے خوابوں سے بھی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ طویل، تھکا دینے والے شکاری دھاوؤں کی راتوں کے دوران سلطان، بہت سوں کی طرح جن کو شکار سے عشق ہوتا ہے، یہ خواب دیکھتا کہ شکار وہ خود ہے، یا، اس ڈر سے کہ ہاتھ سے تخت نہ جاتا رہے، اپنے کو ایک طفل کی جون میں تخت نشین دیکھتا، اور خوجہ اس کی یہ تاویل کرتا کہ تخت پر وہ سدا جوان رہے گا، لیکن صرف ہمارے ہمہ وقت چوکنے دشمنوں کے ہتھیاروں سے برتر ہتھیار بنا کر ہی ان کی دھوکا دہی سے مامون رہ سکے گا۔ سلطان نے خواب دیکھا کہ اس کے دادا سلطان مراد نے اپنی بہادری کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنی تلوار کے محض ایک ہی وار سے ایک گدھے کو اتنی پھرتی سے دولخت کر دیا کہ دونوں لخت سرپٹ دوڑتے ہوئے ایک دوسرے سے دور ہو گئے؛ کہ بدزبان اور بد اطوار عورت، اس کی دادی، جس کا نام کوسم سلطانہ تھا، اپنی قبر سے اسے اور اس کی ماں کا گلا گھونٹنے کے لیے باہر نکل آئی ہے اور الف ننگی اس پر جھپٹی ہے؛ کہ تماشا گھر میں چیڑ کے درختوں کے بجائے انجیر کے درخت ہیں جن سے پھلوں کی جگہ لاشیں لٹکی ہیں؛ کہ شر انگیز لوگ جن کے چہرے اس سے ملتے جلتے ہیں اس کا تعاقب کر رہے ہیں تاکہ اسے بوروں میں دھکیل کر اس کا دم گھونٹ دیں؛ یا کہ اپنی پشتوں پر موم بتیاں اٹھائے، جو ہوا کے باوجود کسی وجہ سے گل نہیں ہو رہی ہیں، کچھوؤں کا ایک لاؤ لشکر اوسکدار کی جانب سے سمندر میں داخل ہوا اور

اب سیدھا محل کی طرف چلا آ رہا ہے، اور ہم نے ان خوابوں کی تفسیر کرنے کی کوشش کی، جنھیں میں نے بڑے صبر اور بہجت کے ساتھ ایک کتاب میں نقل کیا اور ان کی درجہ بندی کی، تاکہ سائنس اور اس ناقابلِ بیان ہتھیار کا بھلا ہو سکے جس کو ضرور بننا چاہیے، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ درباری کس قدر غلط ہیں جو یہ سرگوشیاں کرتے پھرتے ہیں کہ سلطان حکومتی امور سے غفلت برتتا ہے اور اس کے سر میں شکار اور جانوروں کے علاوہ کچھ نہیں۔

بقول خوجہ ہم اس پر بتدریج اثر انداز ہو رہے تھے، لیکن مجھے اپنے کامیاب ہونے پر اب اور یقین نہیں رہا تھا۔ ایک نئے ہتھیار یا رصدگاہ یا سائنس گھر کے قیام کی بابت جو وعدہ اس نے خوجہ سے کیا تھا وہ وفا ہوگا، اور راتوں کے مسلسل رتجگے کے بعد جن میں وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ نئے نئے منصوبوں کے خواب دیکھتا، مہینے گزر جاتے اور وہ ان موضوعات کا سلطان کے سامنے کبھی ذکر بھی نہ چھیڑتا۔ طاعون کے ایک سال بعد، جب وزیرِ اعلیٰ کپر ولو کا انتقال ہوا، خوجہ کو امید باندھنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا: خوجہ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں سلطان کے تأمل کی وجہ کپر ولو کے اقتدار اور شخصیت کا خوف تھا، اور اب جب کہ وزیرِ اعلیٰ مر چکا تھا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے نے، جو باپ کے مقابلے میں کم زور تھا، سنبھال لی ہے، سلطان سے جرأت مندانہ اقدامات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن ہم اگلے تین سال تک بس ان کا انتظار ہی کرتے رہے۔ جو چیز اب مجھے ہکا بکا کیے دے رہی تھی وہ سلطان کی بے عملی نہیں تھی، جو اپنے خوابوں اور شکاری مہمات کی چکاچوند سے چندھیا گیا تھا، بلکہ یہ خیال کہ خوجہ نے اپنی امیدیں ہنوز اس پر ثبت کی ہوئی ہیں۔ یہ تمام سال میں اس دن کا انتظار کرتا رہا تھا جب وہ امید سے دست کش ہو کر ٹھیک مجھ جیسا بن جائے گا! ہر چند وہ اب ''فتح'' کا اتنا زیادہ ذکر نہیں کرتا تھا جتنا پہلے، نہ اپنی روح میں اتنی بالیدگی ہی محسوس کرتا تھا جتنی طاعون کے بعد کے مہینوں کے دوران، تاہم وہ ہنوز اپنے اس خواب کو زندہ رکھے ہوئے تھا کہ ایک نہ ایک دن سلطان کو اپنے ''عظیم الشان منصوبے'' کے ضمن میں شیشے میں اتار لے گا۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانا ہمیشہ ہی تراش لیتا: اس عظیم آتش زدگی کے فوراً بعد، جس نے

پورے استنبول کو ملبے کا ڈھیر بنا ڈالا تھا، اگر سلطان عظیم الشان منصوبوں میں فراخ دلی سے پیسا لگاتا تو اس سے اس کے دشمنوں کو اس کے بھائی کو تخت نشین کرنے کی سازباز کا موقع مل جاتا؛ سلطان کے ہاتھ فی الوقت اس لیے بندھے ہوئے تھے کہ فوج ہن قوم کے خلاف مہم پر گئی ہوئی تھی؛ اگلے سال ہم ان کے جرمنوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کرنے کے متوقع تھے؛ پھر یہ کہ گولڈن ہورن کے کنارے پر نئی والدے مسجد کی تکمیل بھی باقی تھی جہاں خوجہ حاکم اور اس کی ماں ترخان سلطانہ کے ساتھ اکثر جایا کرتا تھا، اور جس کی تعمیر پر ایک خطیر رقم خرچ کی جا رہی تھی؛ اور وہ غیر مختتم شکاری مہمات جن میں میں شریک نہیں ہوتا تھا ان پر مستزاد۔ خوجہ کے شکار سے لوٹنے کے انتظار میں، میں گھر میں پڑا پڑا اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی غرض سے اس ''عظیم الشان منصوبے'' اور ''سائنس'' کے حق میں نت نئے درخشاں خیالات پیدا کرنے کی کوشش کرتا، اور اس کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئی کاہلی سے اونگھنے لگتا۔

ان منصوبوں کے دن سپنے دیکھنے سے بھی اب میرا دل نہیں بہلتا تھا؛ مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی کہ اگر یہ کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے تو ان سے کیا نتائج حاصل ہوں گے۔ خوجہ کو اتنی ہی اچھی طرح معلوم تھا جتنی اچھی طرح مجھے کہ ان سالوں کے دوران جب ہم نے پہلے پہل ایک دوسرے کو جانا تھا، فلکیات، جغرافیا، حتیٰ کہ طبعی سائنس کے بارے میں ہمارے خیالات کی کوئی بنیاد نہیں تھی؛ گھڑیاں، آلات، اور نمونوں کو کونے میں ڈال کر بھلا دیا گیا تھا اور وہ زمانے سے پڑے پڑے زنگ پکڑنے لگے تھے۔ ہم نے ہر چیز کو اس وقت پر اٹھا رکھا تھا جب ہم اس مبہم چیز کا جسے وہ ''سائنس'' کہتا تھا شغل کریں گے؛ ہماری گرفت میں کوئی عظیم الشان منصوبہ نہیں تھا جو ہمیں برباد ہونے سے بچائے گا بلکہ کسی ایسے منصوبے کا بس خواب ہی۔ اس بے کیف طلسمِ خیال پر یقین کرنے کے لیے، جو مجھے فریب دینے میں بالکل ناکام رہا تھا، اور خوجہ کے ساتھ بھائی چارہ محسوس کرنے کے لیے، میں بعض اوقات صفحے پلٹتے ہوئے انھیں اس کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا، یا خیالات کے ذہن میں الل ٹپ آتے وقت خود کو اس کی جگہ رکھتا۔ جب وہ شکار سے واپس آ چکا ہوتا، تو میں یہ ظاہر کرتا کہ اس موضوع سے متعلق جو وہ

میرے پاس سر مارنے کے لیے چھوڑ گیا تھا ایک نیا نکتہ دریافت کرلیا ہے، اور اس نکتے کی روشنی میں ہم ہر چیز کی کایا پلٹ کر رکھ دیں گے: جب میں کہتا: ''سمندر کے اتار چڑھاؤ کا تعلق اس میں خالی ہونے والے دریاؤں کی حدت پر ہے،'' یا، ''طاعون ہوا میں چکراتے ہوئے ننھے ننھے ذروں کے ذریعے پھیلتا ہے، اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ کوچ کر جاتا ہے،'' یا، ''زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور سورج چاند کے گرد،'' تو خوجہ اپنی گرد آلود شکاری پوشاک تبدیل کرتے ہوئے، ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا، اور مجھے محبت سے مسکرانے پر مجبور کر دیتا: ''اور یہاں کے احمق اتنا بھی نہیں سمجھتے!''

پھر وہ طیش میں پھٹ پڑتا جو مجھے بھی اپنی زد میں لے آتا، گھنٹوں ہذیان بکتا رہتا کہ کس طرح حاکم ایک حواس باختہ سؤر کا تعاقب کرتا رہا، اور ایک خرگوش پر جسے اس کے گرے ہاؤنڈ دبوچ لائے تھے آنسو بہانا اس کے واسطے کتنی احمقانہ بات تھی، یہ اعتراف کرنا کہ وہ سب جو اس نے سلطان سے شکار کے دوران کہا تھا کس طرح اس کے ایک کان میں داخل ہوتا اور دوسرے کان سے خارج، اور بار بار تلخی سے پوچھتا کہ آخر کب ان احمقوں کو حقیقت کا احساس ہوگا۔ کیا اتنے بہت سے احمق ایک ہی جگہ محض اتفاق سے جمع ہو گئے ہیں یا یہ ناگزیر تھا؟ وہ کیوں اس قدر احمق ہیں؟

چنانچہ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ اسے اس چیز سے جسے وہ ''سائنس'' کہتا ہے از سرِ نو آغاز کرنا چاہیے، اس بار ان کے دماغوں کی فطرت جاننے کے لیے۔ چونکہ اس سے میرے ان محبوب دنوں کی یاد تازہ ہوگئی جب ہم ایک ہی میز کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور باہمی حقارت کے باوجود کس قدر ایک دوسرے کے مشابہ تھے، میں اس ''سائنس'' پر کام شروع کرنے کے لیے اتنا ہی گرم جوش تھا جتنا خوجہ، لیکن چند ابتدائی کوششوں کے بعد ہم جان گئے کہ اشیا پہلے جیسی نہیں رہی ہیں۔

سب سے پہلے، چونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے کیسے شہ دوں یا کیوں دوں، میں اس پر دباؤ نہیں ڈال سکا۔ اہم تر یہ کہ اس کی اذیتیں اور شکستیں مجھے خود اپنی محسوس ہونے لگیں۔

ایک موقعے پر میں نے یہاں کے لوگوں کے حُمق کی بابت اس کی یاددہانی کرائی، اس حُمق کی مبالغہ آمیز مثالیں دیں، اور یہ محسوس کرایا کہ انھیں کی طرح اس کا مقسوم بھی ناکامی ہی ہے—گو مجھے اس پر یقین نہیں تھا—اور پھر اس کے ردِعمل کا مشاہدہ کیا۔ حالانکہ اس نے مجھ سے سخت اختلاف کیا، بولا کہ اگر ہم اول کام کریں اور اس کام کے لیے خود کو وقف کر دیں تو ناکامی ناگزیر نہیں—اگر، مثال کے طور پر، ہم اس ہتھیار والے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں، تو اب بھی تاریخ کے دریا کے بہاؤ کا رخ موڑ سکتے ہیں جو ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے—اور اس کے باوجود کہ اس نے ''اپنا'' نہیں، جیسا کہ وہ مایوسی کے وقت کرتا تھا، بلکہ ''ہمارا'' منصوبہ کہہ کر میرا دل خوش کیا، اسے اَٹل شکست کے قریب آنے کا خوف بھی دامن گیر تھا۔ میں نے اس کا تصور ایک یتیم بچے کے طور پر کیا، مجھے اس کے طیش اور افسردگی سے الفت تھی کہ یہ مجھے اپنی غلامی کے اولین سالوں کی یاد دلاتے تھے؛ اور میں اس جیسا ہی ہونا چاہتا تھا۔ جب وہ کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے باہر غلیظ، کیچڑ سے لت پت سڑکوں کو تاریک بارش میں یا دھلے دھلائے ٹمٹماتے چراغوں کو گولڈن ہورن کے ساحل پر ایک دو گھروں میں ہنوز فروزاں دیکھ رہا ہوتا، جیسے وہاں کسی نئی علامت کا متلاشی ہو جس سے اپنی امیدیں وابستہ کر سکے، تو یوں محسوس ہوتا کہ کمرے کے اندر اذیت ناکی سے چہل قدمی کرنے والا خوجہ نہیں ہے بلکہ خود میری جوانی۔ وہ شخص، جو کبھی میں ہوا کرتا تھا، مجھے چھوڑ کر جا چکا ہے، اور کونے میں پڑا اونگھنے والا میں بڑی رقابت سے اس شخص کا تمنائی ہے، جیسے میں اس میں اپنے گم گشتہ جوش و خروش کی بازیافت کر سکتا ہوں۔

لیکن یہ بھی ہے کہ انتہائے کار میں اس جوش و خروش سے ہی تنگ آ گیا جو کبھی بھی اپنی افزائشِ نو سے نہیں تھکتا تھا۔ شاہی منجم بننے کے بعد خوجہ کی گیبزے والی املاک میں اضافہ ہو گیا تھا اور ہماری آمدنی بھی بڑھ گئی تھی۔ بس سلطان سے کبھی کبھار گپ شپ کے علاوہ اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً ہم گیبزے جاتے، شکستہ ملوں اور دیہاتوں کی سیر کرتے جہاں بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والے کتے سب سے پہلے ہمارا استقبال کرتے، آمدنی کی جانچ

پڑتال کرتے، اور حساب کتاب کی چھان پھٹک کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ نگراں نے ہمیں کس قدر غچہ دیا ہے۔ ہم حاکم کی تفریح طبع کے واسطے رسالے لکھتے، کبھی ہنستے ہوے، لیکن زیادہ تر اکتاہٹ سے ریں ریں کرتے ہوے، اور بس یہی کام رہ گیا تھا۔ اور اگر میں اصرار نہ کرتا، تو غالباً وہ ان وقفوں کا انتظام نہ کرتا جن میں دنوں بے کار وقت گزاری کے بعد ہم عطر بیز طوائفوں کے درمیان جا پسرتے۔

جس بات نے اس کے ہاتھ پاؤں اور زیادہ پھلا دیے وہ یہ تھی کہ سلطان نے لشکر کی عدم موجودگی سے حوصلہ پا کر اور پاشاؤں کے جرمن مہم یا کریٹن کے فوجی قلعے پر چڑھائی کے واسطے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے، اور اس بات سے کہ اب اس کی والدہ اس کو اپنا کہا سننے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، پھر اپنے اردگرد ان بک بکی لال بجھکڑوں، مسخروں، اور بھروپیوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا جنھیں پہلے محل بدر کر دیا گیا تھا۔ اپنے کو ان جعل بازوں سے ممتاز رکھنے کی خاطر جن سے اسے نفرت اور بیزاری تھی اور جن سے اپنی برتری منوانا چاہتا تھا، خوجہ نے ان سے میل جول نہ رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا، لیکن جب حاکم اصرار کرتا تو ان سے گفتگو کرنے اور ان کی بحثا بحثی کو سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔ ان محفلوں میں ان سوالوں پر بحث کرنے کے بعد کہ جانور ذی روح ہوتے ہیں یا نہیں، اگر ہوتے ہیں تو ان میں سے کون سے جنت میں جائیں گے اور کون سے جہنم رسید ہوں گے، کہ گھونگے نر ہوتے ہیں یا مادہ، ہر صبح طلوع ہونے والا آفتاب نیا آفتاب ہوتا ہے یا محض وہی آفتاب جو دوسری طرف صبح غروب ہوتا ہے، وہ مستقبل سے مایوس ہو کر وہاں سے نکلتا، اور کہتا کہ اگر ہم نے کوئی اقدام نہیں کیا تو سلطان جلد ہی ہماری گرفت سے نکل جائے گا۔

چونکہ وہ ''ہمارے'' منصوبوں کے بارے میں بات کرتا، ''ہمارے'' مستقبل کے بارے میں، میں راضی برضا اس کی ہاں میں ہاں ملاتا جاتا۔ ایک مرتبہ، یہ گرفت میں لانے کے لیے کہ سلطان کے ذہن میں کیا ہے، ہم نے ان نوٹ بکس کی ورق گردانی کی جن میں برسوں تک میں نے ہمارے خواب، ہماری یادیں قلمبند کی تھیں۔ جیسے ہم درازوں کی مشمولات کا شمار کر رہے

ہوں، ہم نے حاکم کے دماغ کی مشمولات کی گنتی کر ڈالی؛ نتیجہ بالکل ہمت افزا نہیں نکلا؛ اگرچہ خوجہ اب بھی بڑے جوش کے ساتھ اس ناقابلِ یقین ہتھیار کی بابت مسلسل ٹرٹر کرتا جو ہمارا نجات دہندہ ثابت ہونے والا تھا، یا ان اسرار کو حل کرنے کے بارے میں جو ہنوز ہمارے دماغوں کے کونوں کھدروں میں پوشیدہ تھے، وہ اب اور یہ طرزِ عمل نہیں اختیار کر سکتا تھا جیسے اسے کسی ایسی تباہ کن شکست کی توقع نہ ہو جو قریب تر آ رہی ہو۔ اس موضوع پر مہینوں بحث کر کے ہم نے خود کو ہلکان کر لیا۔

کیا ''شکست'' سے ہم یہ مطلب نکالتے تھے کہ سلطنت ایک ایک کر کے اپنے جملہ مملوکہ علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا؟ ہم اپنے نقشے میز پر پھیلا دیتے اور سوگواری سے تعین کرتے کون سا علاقہ سب سے پہلے گرفت سے نکلے گا، پھر کون سے پہاڑ یا دریا۔ یا شکست کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد غیر محسوس طور پر بدل یا متغیر ہو جائیں گے؟ ہم تصور کرتے کہ ہو سکتا ہے استنبول میں ہر کس ایک صبح اپنے گرم گرم بستر سے ایک بدلے ہوے شخص کی جون میں اٹھے گا؛ کپڑے کیسے پہننے چاہئیں یہ اسے نہیں معلوم ہوگا، اور نہ یہ یاد ہوگا کہ میناروں کا کیا مصرف ہے۔ یا شاید شکست کا مطلب دوسروں کی برتری کا اقرار اور ان کے اوصاف میں ان کی برابری کرنا تھا: پھر وہ میری وَینس کی زندگی کی کوئی واردات دہراتا، اور ہم تصور کرتے کہ یہاں ہمارے واقف کار کس طرح اپنے سروں پر غیر ملکی ہیٹ منڈھ کر اور ٹانگوں پر پتلونیں چڑھا کر میرے تجربات کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

آخری چارۂ کار کے طور پر ہم نے سلطان کو اپنے وہ خواب پیش کرنے کا فیصلہ کیا جن کی اختراع کے دوران ہم وقت کے گزران کو فراموش کر دیتے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ شکست خوردگی کے یہ رؤیا، جنھوں نے ہماری فنطاسیوں کے شوخ رنگوں میں زندگی پائی تھی، شاید اسے عمل پیرا ہونے کی ترغیب دلا سکیں۔ چنانچہ، پرسکوت، اندھیری راتوں میں، ہم نے ایک پوری کتاب ان تمام مکاشفوں سے بھر دی جو شکست اور ناکامی کی فنطاسیوں سے جنھیں ہم نے ایک افسردہ، یاس بھری مسرت کے ساتھ ایجاد کیا تھا اٹے پڑتے تھے: وہ سر خمیدہ مفلسین، کیچڑ سے

سنی شاہراہیں، عمارتیں جنھیں نیم مکمل ہی چھوڑ دیا گیا تھا، تاریک، اجنبی سڑکیں، اس بات کی منت سماجت کرتے ہوئے لوگ کہ ہر شے ویسی ہی ہو سکے جیسی پہلے ہوا کرتی تھی، اس حال میں کہ لبوں پر وہ دعائیں ہوتیں جن کے مطلب سے وہ ناآشنا تھے، محزون مائیں اور باپ، رنجیدہ آدمی جن کی زندگیاں اتنی کوتاہ تھیں کہ وہ سب جو دوسری سرزمینوں پر حاصل اور تحریری طور پر محفوظ کیا گیا تھا ہم تک پہنچا سکیں، مشینیں جو بے کار پڑی تھیں، روحیں جن کی آنکھیں ماضی کے خوش گوار دنوں کے ندبے سے پرنم تھیں، آوارہ گرد کتے جو محض کھال اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئے تھے، گاؤں والے جن کے پاس اپنی زمین نہیں تھی، بے ٹھکانہ لوگ جو شہر بھر میں جہاں تہاں دیوانہ وار گھومتے پھر رہے تھے، جاہل مسلمان جو پتلون پہنے ہوئے تھے اور تمام جنگیں جن کا انجام شکست تھا۔ میری مدھم پڑتی یادوں کو ہم نے کتاب کے ایک الگ حصے میں درج کیا: وینس میں میری ماں، باپ، بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ میرے اسکول کے زمانے کے پرمسرت اور سبق آموز تجربات کے چند مناظر: جو ہمیں فتح کریں گے، اس طور زندگی گزاریں گے، اور ہمیں لازم ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے پہلے خود کوئی عملی قدم اٹھائیں اور ان کے حریف ہوں! تتمے میں، جسے ہمارے چپ دست کاتب نے نقل کیا، ایک موزوں شعر تھا جس میں بے ترتیب درازوں والی الماری کے استعارے سے فائدہ اٹھایا گیا تھا جو خوجہ کو بے حد مرغوب تھا، اور جسے ایک دروازہ سمجھا جا سکتا تھا جو ہمارے اذہان میں جاگزیں پیچیدہ اسرار کے تاریک معمے پر کھل رہا ہو۔ اس شعر کی نفیس، بڑی باریک بافتہ دھند کی گرفت میں، جو اپنے مخصوص شکوے اور خاموشی کی حامل تھی، ان تمام کتابوں اور رسالوں کا پُرملال جوہر آ گیا تھا جو میں نے خوجہ کے ساتھ مل کر تحریر کی تھیں۔

خوجہ کے اس کتاب کو پیش کرنے کے ایک ماہ بعد، سلطان نے ہمیں اس ناقابلِ یقین ہتھیار پر کام شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے حکم سے ہمارے اوسان خطا ہو گئے، اور ہم کبھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ہماری کامیابی کا دارومدار کس حد تک اس کتاب پر تھا۔

(۹)

جب سلطان نے کہا، ''چلو یہ حیرت انگیز ہتھیار دیکھیں جو ہمارے دشمنوں کو تباہ کر دے گا،'' تو شاید وہ خوجہ کی چھیڑ خوانی کر رہا ہو، شاید اس نے کوئی خواب دیکھا ہو جو خوجہ سے پوشیدہ رکھا ہو، شاید وہ اپنی مطلق العنان والدہ اور ان پاشاؤں کو جنھوں نے اس کا قافیہ تنگ کیا ہوا تھا یہ جتانا چاہتا ہو کہ وہ ''فلسفی'' جو اس نے پال رکھے ہیں کسی نہ کسی مصرف کے ضرور ہیں، شاید اسے خیال گزرا ہو کہ طاعون کے بعد خوجہ کوئی اور معجزہ کر دکھائے گا، شاید وہ فی الواقع شکست کے ان پیکروں سے متاثر ہوا ہو جن سے ہم نے اپنی کتاب بھر ماری تھی، یا شاید یہ سب ہمارے شکست کے پیکروں کا کیا دھرا نہ ہو بلکہ ان چند واقعی فوجی پسپائیوں کا جو اسے ہوئی تھیں جس نے اسے اس کھٹکے سے چوکنا کر دیا ہو کہ، جیسا کہ اسے خدشہ تھا، وہ لوگ جو اس کے بجائے اس کے بھائی کو تخت پر بٹھانے کے خواہاں تھے، اس کو تخت سے ہٹا دیں گے۔ ہم نے ان سارے امکانات پر حواس باختگی کے اس عالم میں غور کیا جب ہم اس بے پناہ آمدنی کا تخمینہ لگا رہے تھے جو گاؤوں، کارواں سرایوں، زیتون کے جھنڈوں سے ہونے والی تھی جو حاکم نے ہمیں اس ہتھیار کی تیاری کے مصارف کے واسطے عطا کیے تھے۔

خوجہ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں صرف اپنی حیرانی سے ہی حیران ہونا چاہیے: کیا وہ جھوٹی تھیں، وہ تمام کہانیاں جو اس نے سال بہ سال سلطان کو سنائی تھیں، رسالے اور کتابیں جو ہم نے تالیف کی تھیں، کہ اب جب کہ سلطان ان پر یقین کرنے لگا ہے ہم کو سزاوار ہے کہ ان پر شک کریں؟ کچھ اور بھی تھا: حاکم کو ہمارے اذہان کی تاریکی میں کیا پیش آ رہا ہے پر تجسس ہونے لگا تھا۔ خوجہ نے بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ یہ وہی کامیابی نہیں ہے جس کے لیے ہم اتنا طویل انتظار کرتے رہے ہیں۔

بالکل تھی، اور اس بار ہم نے ہم کاروں کی طرح کام شروع کیا؛ چونکہ نتیجے کی بابت میں اس کے مقابلے میں کم فکرمند تھا، میں بھی خورسند تھا۔ اگلے چھ سال، جن میں وہ ہتھیار کو وضع کرنے پر ڈٹا رہا، ہم مسلسل خطرے میں رہے۔ اس لیے نہیں کہ بارود سے کھیل رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ خود کو اپنے دشمنوں کے رشک کا ہدف بنا رہے تھے؛ کیونکہ ہر کس و ناکس ہمارے کامیاب یا ناکام ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا؛ اور ہم اس لیے بھی خطرے میں تھے کہ خود بھی انھیں باتوں سے خوفزدہ تھے۔

اول اول تو ہم نے ایک پوری سردیاں محض میز کے پاس بیٹھ کر کام کرنے میں برباد کر دیں۔ ہم مشتعل اور گرم جوش تھے، لیکن ہاتھ میں سوائے ہتھیار کے خیال اور ان مبہم اور بے ہنگم تصورات کے کچھ اور نہیں تھا جو رہ رہ کے ہمارے ذہن میں یہ تصور کرتے وقت آتے کہ ہتھیار ہمارے دشمنوں کا کس بری طرح بھرکس نکال دے گا۔ بعد میں ہم نے کھلی فضا میں جا کر بارود کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ بالکل آتش بازی کے تماشوں کی تیاری والے ہفتوں کے طرح، اس بار بھی ہمارے کارندوں نے ہماری متعینہ مقدار میں مرکبات آمیز کیے، اور پھر ان میں محفوظ فاصلے سے دھماکہ کیا جب کہ ہم بلند قامت درختوں کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں میں ہٹ آئے۔ انوکھی باتوں کے مشتاق لوگ صوتی اعتبار سے مختلف درجوں کے دھماکوں سے چھٹتے رنگین دھویں کو دیکھنے استنبول کے چاروں دانگ سے آئے۔ ہجومِ خلق نے اس میدان کو جہاں ہم نے اپنے خیمے نصب کیے تھے، اہداف، اور اپنی ڈھالی ہوئی کوتاہ اور لمبی نالی والی توپ جمائی تھی، وقت کے

ساتھ ساتھ میلے ٹھیلے کا میدان بنا ڈالا۔ گرما کے ختم پر ایک دن، سلطان بہ نفسِ نفیس پیشگی اطلاع دیے بغیر وہاں نمودار ہوا۔

ہم نے ایک تماشا خاص اس کے لیے کیا، ساری زمین اور آسمان کو دھماکے سے ہلا کر رکھ دیا؛ ایک ایک کر کے کارتوس کے ڈبوں اور توپ کے گولوں کی جنھیں ہم نے بارود کے مختلف مرکبات سے خوب تیار کر رکھا تھا، نئی بندوقیں اور لمبی نالی والی توپیں جو ابھی نہیں ڈھالی گئی تھیں ان کے سانچوں کے خاکوں کی، مقررہ وقت پر چھٹنے والے میکانکی نظام جو لگتا کہ از خود دھماکہ کر رہے ہوں ان سب کی نمائش کی۔ اس نے خوجہ سے زیادہ مجھ میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ شروع میں خوجہ نے مجھے سلطان سے دور رکھنا چاہا لیکن جب تماشا شروع ہو گیا اور سلطان نے دیکھا کہ جس کثرت سے خوجہ حکم صادر کر رہا ہے اتنی ہی کثرت سے میں بھی، کہ ہمارے کارندے میری طرف بھی اتنا ہی دیکھ رہے ہیں جتنا خوجہ کی طرف، تو اس کو تجسّس ہوا۔

جب پندرہ سال میں دوسری بار مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا، تو سلطان نے مجھے یوں دیکھا جیسے پہلے دیکھ چکا ہو لیکن فوری پہچان لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو آنکھیں بند کیے کوئی پھل چکھتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اس کی عبا کے پلو کو بوسہ دیا۔ یہ معلوم کر کے کہ میں یہاں بیس سال سے ہونے کے باوجود ابھی تک مسلمان نہیں ہوا ہوں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس کا ذہن تو کسی اور ہی چیز کی طرف لگا ہوا تھا: ''بیس سال؟'' اس نے کہا، ''کتنی عجیب بات ہے!'' پھر اس نے اچانک مجھ سے وہ سوال پوچھا: ''کیا یہ تم ہو جو اسے یہ سب سکھا رہے ہو؟'' بہ ظاہر یہ اس نے میرا جواب معلوم کرنے کے لیے نہیں پوچھا تھا، کیونکہ وہ ہمارے پارہ پارہ خیمہ سے نکل چکا تھا جس سے بارود اور شورے کی بو آ رہی تھی، اور اپنے خوب صورت سفید گھوڑے کی طرف جا رہا تھا۔ ناگہانی وہ رکا، ہم دونوں کی طرف، جو ٹھیک اس وقت برابر برابر کھڑے تھے، مڑا اور اچانک یوں ہنس دیا جیسے اس نے لاثانی عجائب میں سے وہ عجوبہ دیکھ لیا ہو جسے خدا نے نسل آدمی کا گھمنڈ توڑنے کے لیے خلق کیا ہو، اپنی مہملیت کا احساس دلانے کے لیے ـــ ایک کامل بونہ یا دو جڑواں بھائی

جو ایک ہی مٹر کی پھلی کے دو دانے ہوں۔

اس شب میں سلطان کی بابت سوچ رہا تھا، لیکن خوجہ کے حسبِ خواہش نہیں۔ وہ نہایت تنفر سے اس کا ذکر کرتا رہا، لیکن مجھ پر واضح ہوگیا تھا کہ میں نفرت اور حقارت نہیں محسوس کرسکوں گا: اس کی بے تکلفی نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، اس کی مٹھاس نے، پیار دلار سے بگڑے بچے کے اس انداز نے جو بلا روک ٹوک جو ذہن میں آیا کہہ بیٹھتا ہے۔ میں چاہتا تھا اس جیسا ہو جاؤں یا اس کا دوست بنوں۔ خوجہ کے غصے میں پھٹ پڑنے کے بعد میں جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور یہ سوچتے ہوئے سونے کی کوشش کی کہ سلطان دھوکہ دیے جانے کا مستحق نہیں؛ میں اسے سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بے کم و کاست تھا کیا؟

میری دلچسپی غیر متبادل نہیں رہی۔ ایک دن جب خوجہ نے بادلِ ناخواستہ کہا کہ اس صبح حاکم میری آمد کا بھی متوقع ہے، تو میں اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ یہ خزاں کا ایسا ہی دن تھا جس میں سمندر کی بوباس ہوتی ہے۔ ایک عظیم جنگل میں جو جھڑے ہوئے سرخ پتوں سے اٹا پڑا تھا ہم نے پوری صبح چیڑ کے درختوں کے سایے میں سوسن کے تالاب کے پاس گزاری۔ سلطان کلبلاتے مینڈکوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا جن سے پورا تالاب بھرا تھا۔ خوجہ اس کی تسکین کے لیے بالکل تیار نہیں تھا، اور بس چند پامال سے فقرے دہرا کر رہ گیا جن میں نہ رنگ تھا نہ ندرت۔ سلطان نے اس بدتہذیبی پر، جس نے مجھے شدید صدمہ پہنچایا، سرے سے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ اسے مجھ میں زیادہ دلچسپی تھی۔

تو میں نے مینڈکوں کی کود پھاند کے پیچھے کارفرما میکانیکی عمل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی، ان کے خون کے نظامِ گردش کے بارے میں، کس طرح جسم سے بہ احتیاط جدا کردیے جانے کے بڑی دیر بعد تک بھی ان کے قلب کی دھڑکن جاری رہتی ہے، ان مکھیوں اور کیڑوں کے بارے میں جو ان کی غذا تھے۔ میں نے زیادہ وضاحت سے یہ دکھانے کے لیے کہ بیضہ کتنے مرحلوں سے گزر کر تالاب کا ایک پختہ مینڈک بنتا ہے قلم اور کاغذ کی فرمائش کی۔ جب میں سینٹے کے قلموں سے جو میرے لیے یاقوت جڑے قلمدان میں لائے گئے تصویریں بناتا رہا تو

حاکم توجہ سے ان کا مشاہدہ کرتا رہا۔ مینڈکوں کی جو کہانیاں مجھے یاد تھیں اس نے بالکل تین لطف کے ساتھ سنیں اور جب میں اس مقام پر پہنچا جو شہزادی کے مینڈک کو بوسہ دینے کے بارے میں تھا تو اس نے ایکائی سی لی اور برا سا منھ بنایا، تاہم خوجہ کے بیان کردہ گاؤدی نوجوان جیسا بالکل نہیں لگا؛ بلکہ ایک سنجیدہ دماغ بالغ آدمی زیادہ نظر آیا جو اس بات پر مصر ہو کہ اس کے بردن کی ابتدا سائنس اور فن سے ہو۔ ان پرسکون گھڑیوں کے ختم پر، جن میں خوجہ تمام وقت ناک بھوں چڑھاتا رہا تھا، سلطان نے اپنے ہاتھ میں کی مینڈکوں کی تصویروں کو دیکھا اور بولا "مجھے ہمیشہ یہی شک رہا ہے کہ ان کہانیوں کو گھڑنے والی تمھی ہو۔ یہ تصویریں بھی تمھی نے بنائی ہیں!" اب اس نے مجھ سے مونچھ دار مینڈکوں کے بارے میں پوچھا۔

تو اس طرح میرا تعلق سلطان سے پیدا ہوا۔ اب جب کبھی خوجہ محل جاتا تو میں بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ شروع شروع میں خوجہ کم ہی کچھ کہتا، سلطان سے زیادہ تر بات میں ہی کرتا۔ اس سے اس کے خوابوں، ولولوں، اس کے خوفوں، ماضی اور مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میں سوچتا کہ میرے سامنے جو خوش طبع، ذہین آدمی ہے وہ اس سلطان سے کس درجہ مشابہت رکھتا ہے جس کے بارے میں خوجہ سال بعد سال بات کرتا رہا ہے۔ ان برجستہ سوالوں سے جو وہ کرتا اور اس کی فراست سے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ ٹھیک جب سے ہم نے سلطان کو اپنی تصانیف پیش کی تھیں یہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا ہے کہ میں کس حد تک خوجہ ہوں اور خوجہ کس حد تک میں۔ جہاں تک خوجہ کا تعلق ہے، اس وقت وہ توپ اور لمبی نالیوں کو ڈھلوانے کی فکر میں اتنا زیادہ غلطاں تھا کہ اسے اس تخمین و ظن سے، جو بہرکیف اس کے حسابوں نری حماقت تھی، کوئی سروکار نہیں تھا۔

توپ پر کام شروع کرنے کے چھ ماہ بعد خوجہ کے کان یہ جان کر کھڑے ہوگئے کہ شاہی امیرِ توپ خانہ اس بات پر تاؤ کھائے بیٹھا ہے کہ ان معاملات میں ہم کیوں ٹانگ اڑا رہے ہیں، اور اس نے مطالبہ کیا ہے کہ یا تو خود اسے اس کے عہدے سے برطرف کردیا جائے یا ہم جیسے پاگل احمقوں کو، جو توپ سازی کے فن کو اپنے اس خیال سے کہ کوئی نئی شے ایجاد کررہے

ہیں بدنام کر رہے ہیں، اور استنبول سے باہر نکال دیا جائے۔ لیکن خوجہ کسی قسم کے تصفیے پر آمادہ نہ ہوا، گو شاہی امیرِ توپ خانہ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کا رضامند ضرور معلوم ہوا۔ ایک ماہ بعد، جب سلطان نے ہم سے ہتھیار کو کچھ اس طرح تیار کرنے کے لیے کہا کہ اس میں توپ کا گزر نہ ہو، تو خوجہ اس بات سے بہت زیادہ پراگندہ خاطر نہیں ہوا۔ اب ہم دونوں ہی کو پتا چل گیا تھا کہ جوئی توپیں اور لمبی نالی کی توپ ہم نے ڈھلوائی تھی ان پرانی قسم کی توپوں سے جو برسہا برس سے استعمال ہو رہی تھیں بہتر نہیں تھیں۔

تو بقول خوجہ ہم ایک اور نئے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے جس میں ہر شے کا نئے سرے سے تصور کرنا ضروری تھا، لیکن چونکہ اب میں اس کی برافروختگی اور اس کے خوابوں کا عادی ہو چلا تھا، میرے لیے اگر کوئی چیز نئی تھی تو یہ حاکم سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ اور سلطان کو ہماری صحبت پسند آتی تھی۔ کسی متوجہ باپ کی طرح جو گولیوں پر جھگڑتے ہوئے دو بھائیوں کو یہ کہہ کر ایک دوسرے سے علاحدہ کر دیتا ہے کہ ''یہ تمھاری ہیں، اور یہ تمھاری،'' وہ ہمارے اندازِ تکلم اور برتاؤ کی بابت کوئی تبصرہ کر کے ہمیں ایک دوسرے سے چھڑا دیتا۔ یہ تبصرے، جو کبھی بڑے عاقلانہ نظر آتے اور کبھی بچکانہ، مجھے پریشان کرنے لگے: مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ میری شخصیت مجھ سے کٹ کر الگ ہو گئی ہے اور خوجہ کی شخصیت سے جا ملی ہے، اور اس کے برعکس بھی، اور دونوں میں سے کسی کو اس کا احساس تک نہیں، اور یہ کہ سلطان، اس خیالی مخلوق کو آنکتے ہوئے، ہمیں ہم سے بہتر طور پر جاننے لگا ہے۔

جب ہم اس کے خوابوں کی تعبیر کر رہے ہوتے، یا نئے ہتھیار سے متعلق گفتگو—اور اس وقت اس پر سر مارنے کے لیے ہمارے پاس صرف ہمارے خواب ہی تھے—حاکم یک بہ یک رک جاتا اور، ہم میں سے کسی ایک کی طرف رخ کر کے کہتا، ''نہیں، یہ تو اس کا خیال ہے، تمھارا نہیں۔'' اور بعض اوقات وہ ہمارے افعال میں تمیز کرتا: ''اب تم بالکل اسی کی طرح اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے ہو۔ اپنے طور پر دیکھو!'' میں حیرت کے مارے ہنس پڑتا تو وہ اپنی بات جاری رکھتا، ''ہاں، یہ بہتر ہے، شاباش۔ کیا تم دونوں نے کبھی خود کو ساتھ ساتھ آئینے میں نہیں

دیکھا؟'' ایک موقعے پر اس نے حکم دیا کہ وہ تمام رسائل، bestiaries، اور تقاویم جو ہم نے اس کے واسطے سالوں تک تالیف کی تھیں باہر نکالی جائیں، اور بولا کہ جب پہلی مرتبہ اس نے انھیں پڑھا تھا، تو ایک کے بعد ایک صفحے الٹتے ہوئے اس نے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہم میں سے کس نے کون سا حصہ لکھا ہے، حتیٰ کہ کون سا حصہ ایک نے خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن یہ وہ بہروپیا تھا جسے وہ اس وقت طلب کرتا جب ہم اس کی حاضری دے رہے ہوتے جو خوجہ کو واقعی طیش دلا دیتا، اور مجھے لبھاتا جبکہ ساتھ ہی ساتھ مجھے حواس باختہ بھی کر دیتا۔

یہ شخص نہ چہرے مہرے اور نہ ہیئت میں ہم سے مشابہ تھا، وہ ٹھگنا اور فربہ تھا، اور اس کا لباس بالکل مختلف تھا، لیکن جب اس نے بولنا شروع کیا تو مجھے دھچکا لگا؛ لگتا تھا جیسے وہ نہیں، بلکہ خوجہ بول رہا ہو۔ خوجہ ہی کی طرح، وہ حاکم کے کان کی طرف جھکتا گویا کوئی راز سرگوشی میں بتا رہا ہو، خوجہ ہی کی طرح، دقیق نکتے بیان کرتے وقت اس کی آواز میں مصنوعی، متفکرانہ گمبھیرتا کا رنگ آ جاتا، اور اچانک، بالکل خوجہ کی طرح، جو کچھ بیان کر رہا ہوتا اس کے جوش میں بہہ جاتا، شوق کی سرشاری سے اپنے ہاتھ اور لہراتا تاکہ اپنے ہم سخن کو قائل کر دے اور خود حیرت و تحسین سے بے دم ہو جائے؛ لیکن ہر چند کہ وہ خوجہ کے لہجے ہی میں بات کر رہا تھا، اس نے وہ منصوبے بیان نہیں کیے جن کا تعلق ستاروں یا ناقابلِ یقین ہتھیاروں سے تھا، اس نے تو صرف ان پکوانوں کا ہی شمار کیا جو اس نے محل کے باورچی خانے میں پکانے سیکھے تھے اور وہ اجزا اور مسالے جو انھیں تیار کرنے کے لیے ضروری تھے۔ ادھر سلطان مسکراتا رہا، ادھر اس نقال نے اپنا بہروپ جاری رکھا، یہی کہ ایک ایک کر کے استنبول اور حلب کے درمیان پائی جانے والی کارواں سرایوں کو گنا دے، جس سے خوجہ کا چہرا الٹ پلٹ کر رہ گیا۔ پھر سلطان نے اس بھانڈ سے کہا کہ میری نقل اتارے۔ وہ آدمی جو حواس باختگی سے منہ پھاڑے مجھے گھور رہا تھا وہ میں تھا۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ جب حاکم نے اس سے کہا کسی ایسے شخص کی نقل اتارے جو نصف خوجہ ہو اور نصف میں، تو میں بالکل ہی سحر زدہ رہ گیا۔ اس آدمی کی حرکات کا مشاہدہ کرتے

ہوے، بے اختیارانہ، بالکل سلطان کی طرح، میرا بھی یہ کہنے کو جی چاہا، ''یہ میں ہوں، اور یہ خوجہ ہے،'' لیکن یہ تو خود بھانڈ نے باری باری ہم دونوں کی طرف اپنی انگلی کے اشارے سے کیا۔ سلطان نے نقالچی کی مدح وستائش کر کے اسے رخصت کرنے کے بعد، ہم نے جو دیکھا تھا اس پر غور خوض کرنے کا حکم دیا۔

اس کا کیا مطلب تھا؟ اس شام جب میں نے خوجہ سے ذکر کیا کہ سلطان اس آدمی سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے جس کا نقشہ وہ میرے سامنے برسوں سے کھینچتا رہا ہے، اور کہا کہ جس سمت میں خوجہ اسے لے جانا چاہتا تھا سلطان نے وہ سمت پالی ہے، تو خوجہ ایک بار پھر طیش میں آ گیا۔ اس بار، میں نے محسوس کیا، اس کے پاس اس کا جواز تھا: نقّال کے فن کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خوجہ نے کہا اب وہ دوبارہ محل میں قدم نہیں رکھنے کا، الّا یہ کہ مجبور کر دیا جائے۔ اس کی بالکل یہ نیت نہیں تھی، اب جبکہ وہ موقع جس کا وہ برسوں سے انتظار کرتا رہا ہے آخرکار اس کے ہاتھ آ گیا ہے، کہ ان الّوؤں کے ساتھ وقت برباد کر کے مزید اپنی اہانت کرائے۔ اور چونکہ مجھے سلطان کی سرگرمیوں کا پتا ہے اور بھانڈ بننے کا یارا بھی رکھتا ہوں، اس کے بجائے محل میں ہی جاؤں۔

جب میں نے حاکم سے کہا کہ خوجہ علیل ہے، تو اسے یقین نہیں آیا۔ ''اسے ہتھیار پر کام کرنے دو،'' وہ بولا۔ چنانچہ ان چار سالوں میں جب خوجہ ہتھیار کے منصوبے اور اس کی تکمیل پر کام کرتا رہا، میں محل جاتا رہا اور وہ گھر میں اپنے خوابوں کے ساتھ رہا، جیسا کہ میں رہا کرتا تھا۔

ان چار سالوں میں میں نے سیکھا کہ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہیے، محض اسے جھیلنا نہیں۔ جن لوگوں نے سلطان کو میری تعظیم کرتے ہوے دیکھا، جیسے خوجہ کی کیا کرتا تھا، تو جلد ہی محل میں آئے دن ہونے والی تقاریب اور جشنوں میں مجھے مدعو کرنے لگے۔ کسی دن ایک وزیر کی بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے، اگلے دن حاکم کے یہاں ایک اور ولادت، اس کے بیٹوں کے ختنے کے جشن، ایک اور دن ہنگری کے کسی قلعے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے خوشی، پھر شہزادے کے مکتب

جانے کے پہلے دن کی رسوم اور تقاریب، اور رمضان اور دوسرے تہواروں کی خوشیاں۔ جلد ہی مرغن گوشت اور پلاؤ ٹھونسنے، اور شیروں، شترمرغوں، اور جل پریوں کی شکل میں بنی شکر کی مٹھائیاں اور گری دارمیوں کو جو دنوں کے لیے کافی ہوتے ہڑپ کرنے سے میرا جسم پھول گیا۔ میرے وقت کا زیادہ حصہ کھیل تماشے دیکھنے میں گزرتا: پہلوان، جن کی جلد تیل سے چمکتی، جو جب تک بے ہوش نہ ہو جاتے زور آزمائی کرتے، یا مسجدوں کے میناروں کے درمیان بلندی پر تنے ہوے تاروں پر چلنے والے نٹ اپنی کمر پر اٹھائے ہوے ڈنڈوں کو ہوا میں اچھال اچھال کر لپکنے کا کرتب دکھاتے، نعلوں کی کیلوں کو اپنے دانت سے چبا کر پیس ڈالتے، اور اپنے جسم کو چاقوؤں اور سیخوں سے گودتے، یا ہاتھ کی صفائی دکھانے والے جو اپنی پوشاک میں سے سانپ، فاختائیں، اور بندر برآمد کرتے، ہمارے ہاتھوں میں کے قہوے کے فنجان اور ہماری جیبوں میں کے پیسے پلک جھپکتے میں غائب کر دیتے، یا نیم شفاف پردے کے پیچھے سے دکھائے جانے والے کاراگیوز اور حاجیوت نامی پتلیوں کی پرچھائیوں کے تماشے جن کی فحشیات کا میں متوالا تھا۔ رات کے وقت، اگر کوئی آتش بازی کا تماشا نہ ہو رہا ہوتا، میں اپنے نئے نئے دوستوں کے ساتھ، جن میں سے بیشتر سے اسی دن ملاقات ہوئی ہوتی، ان محلات یا حویلیوں میں سے کسی میں جاتا جہاں سبھی جاتے تھے اور راکی یا شراب پینے اور گھنٹوں تک موسیقی سننے کے بعد میں حسین رقاص لڑکیوں کے ساتھ جو غنودہ غزالوں کی ادائیں دکھاتیں، خوش رو لڑکوں کے ساتھ جو پانی پر چلتے، پرسوز گویّوں کے ساتھ جو حساس اور پرمسرت گانے گاتے جام ٹکرا ٹکرا کر لطف اندوز ہوتا۔

میں اکثر سفیروں کے حویلیوں میں جاتا جو میرے بارے میں بے حد متجسس ہوتے، اور اپنے دل آویز بازو لہراتے ہوے لڑکوں اور لڑکیوں کا محاکاتی رقص دیکھنے کے بعد، یا وینس سے بلائے گئے آرکسٹرا کی تازہ ترین پرزعم خرافات سننے کے بعد، میں اپنی بتدریج بڑھتی ہوئی شہرت کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوتا۔ سفارت خانوں میں مجتمع یورپی مجھ سے ان دل دوز جوکھوں کی بابت پوچھتے جن سے میں گزرا تھا، اس پر حیرت کرتے کہ میں نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں،

کیسے جھیلا ہے، اور ان تمام باتوں کے باوجود آخر کیسے اب بھی زندگی گزار رہا ہوں۔ میں یہ مخفی رکھتا کہ اپنی زندگی چہار دیواری میں اونگھتے ہوئے احمقانہ کتابیں لکھتے گزارتا رہا ہوں، اور اس انوکھی سرزمین کے بارے میں جو انھیں اس قدر بھاتی تھی وہ ناقابلِ یقین کہانیاں سنا دیتا جو میں نے فی البدیہہ گھڑنا سیکھ لیا تھا، جیسا کہ میں سلطان کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ صرف نوجوان لڑکیاں ہی نہیں، جو قبلِ ازدواج اپنے باپوں کے سامنے ظاہر ہورہی ہوتیں، اور سفیروں کی بیویاں جو مجھے پرچا رہی ہوتیں، بلکہ وہ تمام باوقار سفیر اور عہدے دار بھی میری گھڑی ہوئی مذہب اور تشدد کی خونین کہانیوں اور عشق بازی اور حرم کی سازشوں کو تحسین و اشتیاق سے سنتے۔ اگر وہ زیادہ اصرار کرتے تو میں ایک دو ریاستی راز سرگوشیوں میں بتا دیتا یا سلطان کی عجیب وغریب عادات کا ذکر کردیتا جن کے بارے میں سب لاعلم ہوتے اور جو وہیں کھڑے کھڑے میں نے تراشی ہوتیں۔ جب وہ اور زیادہ معلوم کرنا چاہتے، تو میں اس سکوت میں پناہ لیتا جو ان الوؤں کے تجسس کو اور بھڑکا دیتا جن کی تقلید خوجہ ہم سے کرانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن مجھے علم تھا کہ وہ باہم یہ کانا پھونسیاں کررہے ہوتے کہ ہو نہ ہو میں کسی بہت بڑے اور پراسرار منصوبے میں ملوث ہوں جو سائنس پر کامل دست گاہ کا مقتضی ہے، کسی بعید از قیاس ہتھیار کا خاکہ جسے بے اندازہ رقم کی حاجت ہے۔

جب میں شام کے وقت ان حویلیوں، ان محلات سے لوٹتا، میرا ذہن اُن دیکھے ہوئے دل آویز جسموں کے پیکروں سے بھرا ہوا، اور ان تیز سیالوں کے بخارات سے جو میں نے چڑھائے ہوتے دھندلایا ہوا، تو خوجہ کو ہماری بیس سالہ پرانی میز کے پاس بیٹھا ہوا پاتا۔ اس نے خود کو اپنے کام میں اتنی شدّت سے غرق کردیا تھا کہ یہ اس سے پہلے میں نے اس میں کبھی نہیں دیکھی تھی، میز ایسے نمونوں سے بھری ہوتی جو میری سمجھ سے بالا تھے، خاکے، اوراق جو شدید مایوسی کے عالم میں گھسیٹی ہوئی تحریریوں سے پر ہوتے۔ وہ مجھ سے سارا دن جو دیکھا یا کیا ہوتا بیان کرنے کے لیے کہتا، لیکن جلد ہی وہ ان اشغال سے اکتا جاتا جو اسے شرمناک اور احمقانہ معلوم ہوتے، چنانچہ میری بات کاٹ کر اپنے منصوبے کو بیان کرنے لگتا، جس میں وہ ''ہم'' اور

''اُن'' کا ذکر کرتا۔

وہ پھر دہراتا کہ ہر چیز کا رشتہ ہمارے اذہان کے داخلی منظر سے ہے، اس نے اپنے تمام پروجیکٹس کی بنیاد اسی مفروضے پر رکھی ہے، اس نے بڑے جوش کے ساتھ کباڑ سے بھری خانے دار الماری، جسے ہم دماغ کہتے ہیں، کے توازن یا انتشار کی بابت گفتگو کی، لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ کس طرح اس ہتھیار کو بنانے کا نیا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکے گا جس سے اس نے اپنی تمام امیدیں، ہماری تمام امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ مجھے شک تھا کہ کوئی بھی—بہ شمول اس کے، میرے سابقہ خیال کے برخلاف—اس کی تفہیم کے قابل ہو سکے گا۔ اس نے اعلان کیا کہ ایک دن کوئی ہمارے سروں کو کھول کر اس کے ان تمام خیالات کو سچا ثابت کر دکھائے گا۔ اس نے ایک عظیم صداقت کا ذکر کیا جس کا ادراک اس نے طاعون کے دنوں میں اس وقت کیا تھا جب ہم مل کر آئینے میں اپنے پر غور وخوض کررہے تھے: وہ سب اب اس کے ذہن میں واضح ہوگیا تھا، تم نے دیکھا، ہتھیار کی تخلیق صداقت کے اس لمحے میں ہوئی تھی! پھر وہ اپنی لرزتی انگلیوں کے سروں کے اشارے سے مجھے—مجھے جو بلا سمجھے بوجھے سخت متاثر ہوا تھا— کاغذ پر ایک عجیب اوٹ پٹانگ، مبہم اور غیر یقینی ہیئت دکھاتا۔

یہ ہیئت، جو ہر بار دکھائے جانے پر مجھے قدرے زیادہ اجاگر نظر آتی، کسی چیز کی یاد دلاتی محسوس ہوتی۔ اس سیاہ دھبّے کو دیکھتے ہوئے جسے میں تصویر کا ''شیطان'' کہوں گا، میں اچانک یہ کہنے ہی والا ہوتا کہ یہ مجھے کس چیز کی یاد دلاتا ہے، لیکن ایک لمحاتی تردد، یا اس سوچ کے باعث کہ میرا ذہن میرے ساتھ بازی گری کررہا ہے، خاموش رہتا۔ ان چار سالوں کی مدت میں میں کبھی واضح طور پر اس ہیئت کو نہیں سمجھ سکا جو اس نے جانے کتنے صفحوں پر بکھیر رکھی تھی، اس کی ہر نئی نشوونما میں اس کے نقوش کو پہلے سے نسبتاً زیادہ وضاحت سے اجاگر کرتے ہوے، اور جسے، سالہا سال کی جمع شدہ پونجی اور کوشش کے صرفے کے بعد، وہ آخرکار زندگی بخش سکا تھا۔ بعض اوقات میں اسے ہماری روزمرہ کی زندگی کی اشیا سے تشبیہ دیتا، بعض اوقات ہمارے خوابوں میں نظر آنے والے پیکروں سے، ایک دو بار ان چیزوں سے بھی جو گزرے

وقتوں میں ایک دوسرے سے اپنی یادوں کو بیان کرتے وقت نظر آتیں یا جن کے بارے میں گفتگو کرتے، لیکن میں اپنے ذہن سے گزرنے والے ان پیکروں کی وضاحت کے لیے آخری قدم نہ اٹھا سکا، چنانچہ میں اپنے خیالوں کی ابتری کے آگے سپر انداز ہو کر بے سود اس کا انتظار کرنے لگتا کہ ہتھیار خود اپنے اسرار کی پردہ کشائی کرے گا۔ چار سال بعد بھی، جب وہ چھوٹا سا دھبا ایک اچنبھا مخلوق میں تبدیل ہو گیا، ایک عظیم مسجد کی طرح دراز قامت، ایک ہول دلانے والا آسیب جس کے تذکرے سے پورا استنبول ہمہما رہا تھا اور جسے خوجہ سچ مچ کی جنگی مشین کے نام سے پکارتا، اور جب ہر کس و ناکس اسے جس تس چیز سے مشابہ قرار دے رہا تھا، میں ہنوز جو خوجہ نے مجھ سے ماضی میں کہا تھا کہ ہتھیار کس طرح مستقبل میں ظفرمند ہوگا اس کی تفصیل میں گم تھا۔

ایک ایسے شخص کی طرح جو بیدار ہو رہا ہو اور ایک خواب کو یاد کرنے کی جدوجہد جسے حافظہ بڑی سختی سے بھلا دینے کا کوشاں ہو، میں محل پہنچنے پر یہ روشن اور دہشت ناک تفاصیل سلطان کے لیے دہرانے کی کوشش کرتا۔ میں ان پہیوں کا نقشہ کھینچتا، منجنیق، گنبد، بارود اور مشینی بیرم کا جن کی خدا جانے کتنی بار خوجہ نے میرے لیے زبانی تصویر کشی کی تھی۔ لفظ میرے نہیں ہوتے، اور اگرچہ میرا بیان خوجہ کے خروش سے عاری ہوتا، تاہم میں دیکھتا کہ حاکم پر ان کا اثر ہو رہا ہے۔ اور میں بھی اس بات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہتا کہ لفاظی کے اس مبہم طومار، خوجہ کی کامیابی اور نجات کی جوشیلی شاعری کی میری انگھڑ ادائیگی سے اس آدمی میں، جسے میں سنجیدہ دماغ سمجھتا ہوں، امید کرنے کی تحریک پیدا ہو رہی ہے۔ حاکم کہتا کہ خوجہ، جو گھر بیٹھا تھا، میں ہوں۔ اس کی یہ دماغی بازیچہ گری میرے ذہن کو بڑے مکمل طور پر پراگندہ کر دیتی لیکن یہ اب اور مجھے نہیں چونکاتی تھی۔ جب وہ کہتا کہ میں خوجہ ہوں، تو میں اس منطق کو جاری رکھنے میں اس کی پیروی نہ ہی کرنے کو بہتر گردانتا، کیونکہ کوئی دم جاتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ بھی کرے گا کہ یہ ساری چیزیں میں نے ہی خوجہ کو سکھائی ہیں —— وہ کاہل الوجود میں نہیں جو اب ہوں، بلکہ وہ میں جس نے زمانہ ہوا خوجہ کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اے کاش ہم صرف تفریحات کی باتیں کریں،

جانوروں کی، ماضی کے تہواروں کی، یا تجار کے جلوس کی تیاریوں کی، میں نے سوچا۔ بعد میں سلطان نے کہا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہتھیار کے اس منصوبے کے عقب میں میں ہی ہوں۔

اور یہی وہ چیز تھی جو مجھے سب سے زیادہ خوفزدہ کر دیتی۔ برسوں سے خوجہ عوام میں نہیں دیکھا گیا ہے، وہ تقریباً بھلا دیا گیا ہے، یہ میں ہی ہوں جو محلات میں، شہر میں اتنی کثرت سے حاکم کے پہلو میں نظر آتا ہے، اور اب لوگ مجھ سے بری طرح جلنے لگے ہیں! وہ میرے خلاف اپنے دانت کچکچا رہے ہیں، میں جو کافر ہوں، صرف اس لیے نہیں کہ اتنے بہت سے بھیڑوں کے گلوں، زیتون کے جھنڈوں، کارواں سرایوں کی آمدنی اس ہتھیار کے مبہم منصوبے میں، جس کے بارے میں وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ لاف گزاف کر رہے ہیں، پھنسی ہوئی ہے، صرف اس لیے نہیں کہ میں سلطان کا اتنا مقرّب ہوں، بلکہ اس لیے بھی کہ اس ہتھیار پر کام کر کے ہم دوسروں کے کاموں میں ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ جب میں ان کی بدگوئی کے خلاف اپنے کان بند کرنے سے عاجز رہتا، تو خوجہ یا سلطان سے اپنے خدشات کا ذکر کر دیتا۔

لیکن وہ کوئی ردعمل ظاہر نہ کرتے۔ خوجہ نے خود کو مکمل طور پر اپنے کام میں غرق کر لیا تھا۔ بوڑھوں کی طرح جو اپنے شباب کے دنوں کے جوش اور ولولے کی تمنا کرتے ہیں، میں بھی اس کے غصے کا آرزو کرتا۔ ان آخری ماہ جن میں اس نے کاغذ پر پھیلے ہوئے اس سیاہ اور مبہم دھبے کی تفاصیل کے ساتھ پرورش کی اور ایک مکروہ عفریت ڈھالنے کے سانچے کے خاکوں میں اس کی قلب ماہیت، ایسے سانچوں اور اتنے وزنی لوہے کو ڈھالنے پر جس کو گزند پہنچانے میں کوئی توپ کامیاب نہ ہو سکے ناقابلِ یقین رقم صرف کی، اس نے اس شرانگیز غپ شپ کو سننے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی جس سے میں نے اسے آگاہ کیا؛ اس نے صرف سفیروں کی حویلیوں میں دلچسپی کا اظہار کیا جہاں اس کے کام کے چرچے تھے: یہ سفیر کس قسم کے آدمی تھے، ان کا کیا خیال تھا، کیا اس ہتھیار کی بابت ان کی کوئی رائے تھی؟ اور سب سے زیادہ اہم: سلطان ان ملکوں میں ریاست کی نمائندگی کے واسطے وفد بھیج کر سفارت خانوں کے قیام کی بابت کبھی کیوں نہیں سوچتا؟ مجھے احساس ہوا کہ وہ یہ عہدہ اپنے واسطے چاہتا تھا، یہاں کے احمقوں سے فرار ہو کر ان

لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اس خواہش کا کبھی برملا اظہار نہیں کیا، ایسے دنوں میں بھی نہیں جن میں وہ اپنے خاکوں کو کبھی بھی عملی جامہ پہنانے سے مایوس ہو جاتا، مثلاً اس وقت جب وہ لوہا جو اس نے ڈھالا تھا چٹخ گیا، یا جب ڈرتا کہ جلد ہی پیسہ ختم ہو جائے گا۔ بس ایک دو بار ہی اس کے منہ سے نکل گیا کہ وہ ''ان کے'' اہلِ سائنس سے تعلقات قائم کرنے کا خواہشمند ہے؛ شاید وہی اس صداقت کو سمجھ سکیں جو اس نے ہمارے اندرونِ دماغ کی بابت دریافت کی ہے؛ وہ وَینِس، فلانڈرز، یا جو کوئی بھی دور دراز کا ملک اس لمحے اسے یاد آیا اس کے اربابِ علم سے مراسلت کرنا چاہتا ہے۔ ان میں کے بہترین کون سے ہیں، کہاں رہتے ہیں، ان سے مراسلت کی کیا صورت نکلے، کیا میں سفیروں سے یہ معلومات حاصل کر سکتا ہوں؟ میں ان دنوں میں ہتھیار سے، جو انتہائے کار شرمندۂ تعبیر ہونے ہی والا تھا، بہت کم دلچسپی لیتا تھا اور خود کو عیش کوشی کے حوالے کر دیا تھا، اس کی ان امیدوں کو، ان کی گرفتہ خاطری کے شائبوں کے باوصف جو ہمارے رقیبوں کے دلوں کو لبھانے کا باعث ہوتے، فراموش کرتے ہوئے۔

سلطان بھی ہمارے دشمنوں کی افواہوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ان دنوں میں جب خوجہ، جو ہتھیار کو آزمانے کے لیے تیار تھا، ایسے بہادر آدمیوں کا متلاشی تھا جو دھات کے اس ہیبت ناک انبار میں داخل ہو سکیں اور زنگ خوردہ لوہے کی دم گھونٹتی بساند میں اڑن پہیوں کو گھما سکیں، سلطان نے ان افواہوں کی بابت میری شکایت کو سننے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔ اس نے، ہمیشہ کی طرح، مجھ سے کہا کہ خوجہ کی کہی ہوئی باتیں دہراؤں۔ اسے اس پر یقین تھا، ہر چیز سے مطمئن تھا، اس پر اعتماد کرنے پر اسے ذرا بھی پچھتاوا نہ تھا: اور ان تمام باتوں کے لیے وہ میرا احسان مند تھا۔ اور ہمیشہ ہی اس وجہ سے: کیونکہ میں نے ہی ہر چیز خوجہ کو سکھائی تھی۔ خوجہ ہی کی طرح، وہ بھی ہمارے سروں کے اندرون کی بابت گفتگو کرتا؛ اور پھر وہ دوسرا سوال اٹھاتا جو اس کی اس دلچسپی سے مطابقت رکھتا تھا؛ جیسا کہ خوجہ نے خود کسی زمانے میں کیا تھا، سلطان مجھ سے پوچھتا کہ وہ اس ملک میں کس طرح رہتے ہیں، میرے سابقہ وطن میں۔

میں خوابوں سے اس کی تواضع کرتا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ کہانیاں، جن میں سے بیشتر پر اب میں خود یقین کرنے لگا ہوں کیونکہ اتنی بار انھیں دہرا چکا ہوں، وہ چیزیں تھیں جن کا تجربہ واقعی مجھے اپنی جوانی میں ہوا تھا یا یہ وہ مکاشفے تھے جو میرے قلم سے جب بھی میز پر اپنی کتاب لکھنے کے لیے بیٹھتا رواں ہو جاتے؛ بعض اوقات میں دو ایک کذب بیانیاں جو ذہن میں در آتیں ان کی آمیزش بھی کر دیتا تھا۔ میرے پاس کچھ حکایتیں تھیں جو بار بار دہرائے جانے کے سبب خاصی پھیل گئی تھیں، چونکہ حاکم نے اس تفصیل میں کہ لوگ جو لباس زیب تن کرتے تھے اس میں بٹنوں کی بھرمار ہوتی تھی دلچسپی کا اظہار کیا تھا، میں حتماً اسے دہراتا اور ایسی کہانیاں سناتا جن کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ ان کا تعلق میری یادوں سے تھا یا میرے خوابوں سے۔ لیکن ایسی چیزیں بھی تھیں جنھیں پچیس سال گزرنے کے بعد بھی میں ہنوز نہیں بھولا تھا، چیزیں جو حقیقی تھیں: وہ گفتگو جو میرے اور میرے والدین، اور بھائی بہنوں کے درمیان لیموں کے درختوں کے نیچے ناشتے کی میز کے گرد ہوئی تھی! یہ وہ تفاصیل تھیں جن سے سلطان کو کم سے کم دلچسپی تھی۔ اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ بنیادی طور پر ہر زندگی دوسری زندگی کے طرح ہی ہوتی ہے۔ کسی وجہ سے مجھے اس بات نے خوفزدہ کر دیا: سلطان کے چہرے پر ایک شیطانی تأثر تھا جو پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا، اور میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس سے اس کی کیا مراد ہے۔ جب میں اس کے چہرے کی طرف اندیشے سے دیکھ رہا تھا، مجھ میں یہ کہنے کی کہ ''میں، میں ہوں'' ایک لہر سی اٹھی۔ یہ گویا یوں تھا، اگر مجھے یہ لایعنی فقرہ کہنے کی جرأت ہو سکے تو میں افواہ پردازوں کے وہ سارے حربے مٹی میں ملا دوں گا جن کے ذریعے وہ میری کسی دوسرے میں کایا کلپ کرنے کی ساز باز کر رہے تھے، وہ دوسرا جس کا کردار خوجہ اور سلطان ادا کر رہے تھے، اور اپنی ذات میں پھر سے نہات آسودہ خاطر رہ سکوں گا۔ لیکن ان لوگوں کی طرح جو کسی غیر یقینی بات کے محض ذکر ہی سے کوسوں دور بھاگتے ہیں کہ کہیں ان کی سلامتی خطرے میں نہ پڑ جائے، میں مارے خوف کے خاموش رہتا۔

یہ موسمِ بہار میں ہوا، ان دنوں میں جب خوجہ نے ہتھیار پر کام ختم کر لیا تھا لیکن اس کی آزمائش کرنے سے اس لیے قاصر رہا تھا کہ حسبِ ضرورت آدمیوں کی جماعت اکٹھی نہیں کر سکا

تھا۔ اس کے فوراً بعد، ہمیں اس بات پر اچنبھا ہوا کہ حاکم فوج کے ساتھ پولینڈ کی مہم پر چلا گیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ یہ حرفِ آخر ہتھیار کیوں نہیں لے گیا تھا، مجھے کیوں نہیں لے گیا تھا، کیا اسے ہم پر اعتماد نہیں تھا؟ ان سبھوں کی طرح جنھیں استنبول ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا، ہم نے بھی یہی خیال کیا کہ سلطان جنگ پر نہیں بلکہ شکار کھیلنے گیا ہے۔ خوجہ اس بات پر خوش تھا کہ ایک اور سال اس کے ہاتھ آ گیا ہے؛ چونکہ میرے اشغال اور تفریح کے لیے کچھ باقی نہ رہا تھا، ہم دونوں ساتھ ساتھ ہتھیار پر کام میں جٹ گئے۔

مشین کو چلانے کے لیے آدمیوں کی بھرتی بڑے جوکھم کا کام ثابت ہوئی۔ کوئی بھی اس ہیبت ناک، پراسرا گاڑی کے اندر جانے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ خوجہ نے یہ بات پھیلا دی تھی کہ وہ اچھا معاوضہ دے گا، ہم نے ڈھنڈورچیوں کو شہر بھیجا، جہاز سازی کے کارخانوں اور توپوں کی ڈھلائی کے کارخانوں میں بھیجا، قہوہ خانوں کے نکموں میں مطلوبہ آدمیوں کو تلاش کیا، بے گھروں اور مہم جویوں میں۔ بیشتر آدمی جو ہم نے فراہم کیے، اگر وہ اپنے خوف پر غالب آ بھی گئے اور لوہے کے انبار کے اندر داخل ہو بھی گئے، جلد ہی رسا تڑا کر بھاگ نکلے، کہ ان میں گرمی میں تپتے ہوئے اس عجیب الخلقت کیڑے کی تنگ جگہ میں پھنسے پھنسے اڑن پہیوں کو چلانے کا یارا نہ تھا۔ گرمیوں کے آخر آخر میں جب ہم اس گاڑی کو چلانے کے قابل ہوئے، سالہا سال سے پراجیکٹ کے واسطے جمع شدہ پونجی ختم ہوگئی۔ متجسس لوگوں کی سٹپٹائی اور خوفزدہ نگاہوں کے سامنے ہتھیار انگھڑپن سے کلبلایا، اور فتح کے نعروں کے درمیان دائیں بائیں حرکت کی جیسے کسی خیالی قلعے پر حملہ آور ہو رہا ہو، اپنے گولے برسائے، پھر ساکت ہوگیا۔ ہمارے گاؤں اور زیتون کے باغوں سے پیسا متواتر آتا رہا، لیکن ہم نے جو جماعت اکٹھی کی تھی اسے قائم رکھنے کے مصارف بے حد گراں ثابت ہوئے اور خوجہ کارندوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوگیا۔

سردیاں انتظار میں گزر گئیں۔ جنگی مہم سے واپس ہوتے ہوئے حاکم اپنے محبوب اَیدرنہ میں ٹھہر گیا؛ کسی نے ہمیں طلب نہ کیا، ہم اکیلے ہی رہ گئے۔ چونکہ صبح کے وقت محل میں کوئی ایسا نہ تھا جس کا دل ہم اپنی کہانیوں سے بہلاتے، اور نہ شام کے وقت حویلیوں میں کوئی ایسا جس

سے میں لطف اندوز ہوسکوں، ہمارے لیے کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے وَینِس کے ایک پینٹر سے اپنی پورٹریٹ بنوانی شروع کی اور عود کی موسیقی سیکھنے کے لیے سبق لینا؛ خوجہ جب دیکھو قدیم دیواروں کے پاس کُلّے دِبی اپنے ہتھیار کے دیدار کے واسطے بھاگتا جس کی حفاظت کے لیے ایک چوکیدار تعینات کر دیا گیا تھا۔ اس میں جہاں تہاں اضافہ کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا، لیکن جلد ہی اس سے بھی اکتا گیا۔ آخری سردیوں کی راتوں میں جو ہم نے ساتھ گزاریں، اس نے نہ ہتھیار کا اور نہ اس سے متعلق اپنے منصوبے کا کوئی ذکر کیا۔ ایک غفلت سی اس پر اتر آئی تھی، لیکن اس لیے نہیں کہ اس کا جذبہ سرد پڑ گیا تھا —اس کی یہ حالت دراصل اس لیے ہوئی تھی کہ میں اسے مزید تحریک نہیں دلا رہا تھا۔

رات کو ہم اپنا سارا وقت انتظار میں گزارتے، ہوا یا برفباری کے ختم ہونے کے انتظار میں، رات گئے سڑک پر گذرتے ہوئے پھیری والوں کی سودا بیچنے کے لیے آخری پکار کے انتظار میں، آگ کے سرد پڑنے کے انتظار میں تاکہ چولہے میں اور لکڑی جھونک سکیں۔ سردیوں کی ایک ایسی ہی رات میں جس کے دوران ہم بہت کم بولے تھے، اکثر خود اپنے خیالات کے دھارے میں بہتے چلے گئے تھے، خوجہ نے اچانک کہا کہ میں بہت زیادہ بدل گیا ہوں، کہ میں آخرکار ایک بالکل ہی مختلف آدمی بن گیا ہوں۔ میرے شکم میں سوزش سی ہوئی، مجھے پسینہ آ گیا؛ میں اس کی مخالفت کرنا چاہتا تھا، کہنا چاہتا تھا کہ وہ غلطی پر ہے، کہ میں ویسا ہی ہوں جیسا ہمیشہ رہا ہوں، کہ ہم ایک دوسرے جیسے ہیں، کہ اسے مجھ پر ویسی ہی توجہ دینی چاہیے جیسی پہلے دیتا تھا، کہ اب بھی ہمارے پاس گفتگو کے لیے بہت، بہت سی باتیں ہیں، لیکن وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا؛ میری نگاہیں میری اس پورٹریٹ پر جا پڑیں جو اسی صبح میں گھر لایا تھا اور ایک دیوار سے ٹکا دی تھی۔ میں بدل گیا تھا: دعوتوں میں خوب ٹھونس کر کھانے کی وجہ سے میں فربہ ہوگیا تھا، ٹھوڑی کے نیچے کی کھال لٹک آئی تھی، گوشت ڈھیلا پڑ گیا تھا، حرکات میں سستی آ گئی تھی؛ بدتر یہ کہ میرا چہرہ بالکل مختلف ہوگیا تھا؛ شراب و کباب کی ان پرشور محفلوں میں پینے پلانے اور ہمبستری کرنے سے میرے ہونٹوں کے گوشوں میں ایک فحش سے تأثر سمٹ آیا تھا، وقت بے وقت

سونے، نشے میں مدہوش ہوجانے سے میری آنکھیں بے رونق ہوگئی تھیں، اور ان احمقوں کی طرح جو اپنی زندگی، دنیا، اور اپنے آپ سے مطمئن ہوتے ہیں، میری نگاہ میں ایک اکھڑی سی نچنتی آ گئی تھی، لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں اپنی نئی حالت سے آسودہ ہوں: میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بعد میں، اس وقت تک جب ہمیں پتا چلا کہ سلطان نے ہمیں اور ہمارے ہتھیار کو جنگی مہم کے لیے اَیدرنہ بلا بھیجا ہے، مجھے بار بار ایک خواب آتا: ہم وینس میں ایک نقاب پوش رقص کی محفل میں ہیں جو اپنی افراتفری میں استنبول کی تقاریب کی یاد تازہ کررہی ہے: جب ''طوائفوں'' نے اپنے نقاب اتارے تو میں نے جمگھٹے میں اپنی ماں اور منگیتر کو پہچان لیا، اور میں نے بھی اپنا نقاب اس امید میں علاحدہ کردیا کہ وہ بھی مجھے پہچان لیں، لیکن کسی وجہ سے انھیں معلوم نہ ہوسکا کہ یہ میں ہوں، وہ اپنے نقابوں سے میرے عقب میں کسی کی طرف اشارہ کررہی ہیں؛ جب میں نے مڑ کر دیکھا، تو وہ شخص جو جانتا ہوگا کہ میں، میں ہوں خوجہ نکلا۔ پھر جب میں اس کے قریب گیا، اس امید میں کہ وہ مجھے پہچانے گا، تو وہ شخص جو خوجہ تھا، اس نے بغیر کچھ کہے اپنا نقاب اتار دیا اور اس کے پیچھے سے، میرے اندر احساس جرم کی ایک خوفزدہ کرنے والی ٹیس سی اٹھی جس نے مجھے خواب سے بیدار کردیا، میری جوانی کا پیکر نمودار ہوا۔

(۱۰)

گرما کے آغاز میں خوجہ یہ اطلاع ملتے ہی کہ سلطان ہمارا اور ہتھیار کا اَیدرنہ میں متوقع ہے آخرکار میدان عمل میں کود پڑا۔ ٹھیک تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے ہر چیز کو تیار رکھا تھا، سردیوں بھر ان لوگوں کی جماعت سے جو ہتھیار کو چلانے پر مأمور تھے رابطہ قائم رکھا تھا۔ تین دن کے اندر اندر ہم مہم کے لیے تیار ہوگئے۔ آخری شب اس نے کچھ اس طرح کاٹی گویا ہم نئے مکان میں منتقل ہورہے ہوں، پھٹی جلدوں والی اپنی پرانی کتابوں، رسائل، زرد پڑتے ہوئے اولین مسودات، اپنی ذاتی چیزوں، وغیرہ کو الٹتا پلٹتا رہا۔ اس نے اپنی زنگ آلود نماز کی گھڑی کو کام کے قابل بنایا، فلکیات کے آلات کی جھاڑ پونچھ کی۔ فجر تک وہ جاگتا رہا اور اس اثنا میں پچیس سالوں کے کتابوں کے کچے مسودوں، نمونوں اور ہتھیاروں کے خاکوں کا معائنہ کرتا رہا۔ سورج نکلنے کے وقت میں نے دیکھا وہ اس چھوٹی سی نوٹ بک کے خستہ اور زرد شدہ ورق الٹ رہا ہے جو میں نے ہماری اولین آتش بازی کے مظاہرے سے متعلق تجربات کے مشاہدوں سے پر کیے تھے۔ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا: کیا یہ ہم اپنے ساتھ لے چلیں؟؛ کیا یہ کارآمد ہوں گے، میرا کیا خیال ہے؟ جب اس نے دیکھا کہ میں اسے خالی خالی نظروں سے تک رہا

ہوں، تو ان چیزوں کو نہایت بے کیفی کے عالم میں ایک طرف ڈال دیا۔

خیر، جو کچھ بھی سہی، اَیدرنہ کے اس دس روزہ سفر میں ہم نے خود کو ایک دوسرے سے قریب محسوس کیا، پرانے زمانے کی قربت سے کم ہی سہی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خوجہ پرامید تھا؛ ہمارا ہتھیار، جسے لوگ باگ عجیب الخلقت، کیڑا، شیطان، تیرانداز کچھوا، رواں دواں برج، لوہے کا ڈھیر، سرخ مرغ، پہیے دار پتیلا، دیو، یک چشم دیو، راکشس، سؤر، خانہ بدوش، نیل چشم اول جلول کے نام سے پکارتے، سڑک پر آہستہ آہستہ روانہ ہوا، چیخوں اور کراہوں کے ہیبت ناک، بے ہنگم شور کے درمیان، ہر دیکھنے والے میں بعینہٖ وہی دہشت طاری کرتا ہوا جو خوجہ کا مقتضیٰ تھی، اور اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا جس کا وہ متوقع نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل خوشی سے کھل گیا کہ متجسین آس پاس کے دیہاتوں سے نکل کر سڑک کے سہارے سہارے پہاڑیوں پر قطار بنائے جمع ہو گئے ہیں، گردنیں لمبی کر کے اس مشین کے دیدار کی کوشش کر رہے ہیں جس کے قریب آتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ رات کے وقت، جس کے سکوت کا اندازہ جھینگروں سے ہو رہا تھا، جب ہمارے آدمی سارا دن خون پسینہ بہانے کے بعد اپنے خیموں میں لمبی تانے سو رہے ہوتے، خوجہ اس تباہی کا میرے لیے نقشہ کھینچتا جو اس کا سرخ مرغ ہمارے دشمنوں پر لانے والا تھا۔ ٹھیک ہے، وہ اتنے جوش کا اظہار نہیں کر رہا تھا جتنا پہلے کیا کرتا تھا، اور میری ہی طرح اس بات سے پریشان تھا کہ ہتھیار کی بابت سلطان کے حلقے اور افواج کا کیا ردعمل ہوگا، اور حملے کی ترتیب میں اسے کیا مقام دیا جائے گا، ان تمام باتوں کے باوجود وہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ ہمارے ''آخری موقعے'' کی بات کرنے کا اہل تھا، کس طرح ہم نے سیلاب کا رخ اپنے حق میں موڑ دیا ہے، اور اس سے بھی اہم یہ کہ ''ان کے اور ہمارے'' بارے میں بات کرنے کا اہل جن کی بابت اس کے مالیخولیے میں ذرا کمی نہیں آئی تھی۔

ہتھیار اَیدرنہ میں دھوم دھام سے داخل ہوا، جس کا صرف حاکم اور مصاحبین میں سے چند بے شرم خوشامدیوں نے ہی کسی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سلطان نے خوجہ کی کسی دیرینہ دوست کی طرح پزیرائی کی، جنگ چھڑ جانے کے امکان کی افواہیں گرم تھیں، لیکن تیاری اور

عجلت کم کم؛ وہ اپنے ایام ایک دوسرے کی قربت میں گزارنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا؛ جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اطراف کے تاریک جنگل میں پرندوں کی چہچہاہٹ سننے کے لیے جاتے، یا مینڈکوں کے مشاہدے کے لیے کشتی میں تنجہ اور مَے رِچ دریاؤں کے بہاؤ کے رخ، یا عقابوں سے لڑائی میں زخمی ہونے والے سارسوں کو تھپتھپانے جو مسجدِ سلیمیہ کے صحن میں کراہ رہے ہوتے، یا ایک بار پھر ہتھیار کو تدبیراتی نقل و حرکت کرتے دیکھنے کے لیے، تو میں ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خاصی کوفت ہوتی کہ ان کے تبادلۂ خیالات میں شریک ہونے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا، کوئی ایسی بات نہیں جو میں ان سے خلوص کے ساتھ کہہ سکوں یا جسے وہ دلچسپ پا سکیں۔ شاید میں ان کی قربت پر جلن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ آخر کار میں ان تمام باتوں سے بیزار ہو گیا ہوں۔ خوجہ اب بھی وہی پرانی شاعری بگھار رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور صدمہ ہوتا کہ حاکم کس طرح فتح کی اس من گھڑت بوسیدہ کہانی سے اب بھی فریب کھانے پر آمادہ ہے، ''ان کی'' برتری کی کہانی، اس پر کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود کو خوابِ گراں سے بیدار کریں اور عمل پیرا ہوں، مستقبل اور ہمارے دماغوں کے اسرار کی کہانی۔

ایک دن، ایسی گرمیوں کے وسط میں جو افواہوں سے ابلی پڑ رہی تھی، خوجہ نے کہا کہ اسے ایک مضبوط ساتھی کی ضرورت ہے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ ہم تیز رفتاری سے اَیدرنہ سے گذرے، خانہ بدوشوں اور یہودیوں کے محلوں سے ہوتے ہوئے، چند خاکستری سڑکوں سے جن پر میں پہلے بھی مٹرگشت کر چکا تھا اور دل گرفتگی کے اسی احساس سے مغلوب ہوا تھا جس سے اب پھر ہو رہا تھا، اور نادار مسلمانوں کے گھروندوں سے جن میں سے بیشتر ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آ رہے تھے۔ انجام کار، جب مجھے احساس ہوا کہ عشق پیچاں سے اَٹے ہوئے گھر جو میں نے اپنے بائیں طرف دیکھے تھے اب میرے دائیں طرف آ گئے ہیں، تو سمجھ گیا کہ ہم لوٹ رہے تھے؛ میں نے پوچھا اور جواب ملا کہ ہم فِل دمَہ علاقے میں ہیں۔ خوجہ نے ناگہانی ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سبز آنکھوں والے ایک ہشت سالہ بچے نے

دروازہ کھولا۔ ''شیر،'' خوجہ نے اس سے کہا، ''شیر سلطان کے محل سے بھاگ نکلے ہیں، اور ہم انھیں تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے بچے کو دھکا دے کر ایک طرف کیا اور مجھے اپنے پیچھے لیے لیے اندر داخل ہو گیا۔ ہم اندرونِ خانہ کی نیم تاریکی سے، جس میں برادے اور صابن کی بو پھیلی ہوئی تھی، بہ عجلت گزرتے ہوئے چرچراتی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کی ایک طویل راہداری میں آئے؛ خوجہ اس سے پھوٹتے ہوئے دروازے کھولنے لگا۔ پہلے کمرے میں ایک بوڑھا آدمی پڑا اونگھ رہا تھا، اس کا دانتوں سے خالی منھ پھٹاس کھلا تھا، اور دو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بچے تھے جو اس کی ڈاڑھی کی طرف پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے اور جنھوں نے دروازہ کھلتا دیکھ کر قلانچ بھری۔ خوجہ نے وہ دروازہ بند کیا اور ایک دوسرا دروازہ کھولا؛ اندر رضائی گدوں اور ان کے لوازمات کا انبار لگا تھا۔ وہ بچہ جس نے سڑک کی طرف والا دروازہ کھولا تھا، اس نے تیسرے کمرے کے دروازے کا قبضہ لپک کر خوجہ سے پہلے ہی پکڑ لیا اور بولا، ''یہاں کوئی شیر ویر نہیں ہیں، صرف میری ماں اور چچی ہیں،'' لیکن خوجہ نے بہرکیف دو عورتوں پر دروازہ کھول ہی دیا جو ہماری طرف پیٹھ کیے مدھم روشنی میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ چوتھے کمرے میں ایک شخص جو رضائی میں ٹانکے لگا رہا تھا اور ڈاڑھی نہ ہونے کے سبب مجھ سے زیادہ مشابہ تھا، خوجہ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ ''پاگل آدمی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''ہم سے کیا لینے آئے ہو؟'' ''سیمرا کہاں ہے؟'' خوجہ نے پوچھا۔ ''وہ دس سال ہوئے استنبول چلی گئی تھی،'' آدمی نے جواب دیا۔ ''سنا ہے کہ طاعون میں مر گئی۔ تم بھی کیوں نہیں ٹھکانے لگ گئے؟'' بغیر ایک لفظ کہے خوجہ سیڑھیاں اتر کے گھر سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے خود بھی نکلتے ہوئے میں نے عقب میں ایک بچے کو چلاتے اور ایک عورت کو جواب دیتے ہوئے سنا: ''شیر یہاں تھے، اماں!'' ''نہیں بیٹے، تمھارے چچا اور ان کے بھائی!''

شاید اس لیے کہ میں ماضی کو بھلا دینے پر قادر نہیں تھا، یا شاید اپنی نئی زندگی اور اس کتاب کو قلمبند کرنے کی تیاری کر رہا تھا جسے آپ ہنوز بڑے صبر و تحمل سے پڑھ رہے ہیں، دو ہفتے بعد فجر کے وقت میں ٹھیک اسی جگہ لوٹا، پہلے پہلے، اولین روشنی میں صاف دکھائی نہ دینے

کے سبب، مجھے گھر تلاش کرنے میں دقت ہوئی؛ اور جب تلاش کر لیا تو اس راستے سے واپس ہوا جس کے بارے میں میرا گمان تھا کہ یہ مسجدِ بایزید کے شفاخانے جلد از جلد پہنچنے کے لیے کوتاہ ترین راہ ہوگا۔ شاید اس لیے کہ یہ سوچنے میں مجھ سے غلطی ہوئی تھی کہ خوجہ اور اس کی ماں نے تیز ترین راستہ اختیار کیا ہوگا، مجھے سفیدوں کے سائے میں پھیلی ہوئی وہ مختصر گزرگاہ نہیں ملی جو پل کی طرف جاتی تھی؛ تاہم مجھے ایک سڑک ضرور ملی جس کے کنارے سفیدوں کی قطار لگی تھی، لیکن اس کے نزدیک کوئی ندی ودی نہیں تھی جہاں برسوں پہلے وہ ستانے بیٹھتے ہوں اور حلوہ کھاتے ہوں۔ اور شفاخانے میں ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں تھا جن کا میں نے تصور کیا تھا، وہ اب کیچڑ زدہ نہیں تھا بلکہ بے حد صاف و شفاف، بہتے پانی کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، نہ ہی رنگ برنگی بوتلیں تھیں۔ جب میں نے ایک زنجیر بہ کف مریض کو دیکھا تو ایک ڈاکٹر سے اس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا: یہ محبت میں مبتلا ہو گیا تھا، دماغ چل گیا ہے، اور سبھی پاگلوں کی طرح یقین کرتا ہے کہ وہ کوئی اور ہے؛ وہ مجھے اور بھی بتاتا، لیکن میں وہاں سے چل دیا۔

فوج کشی شروع کرنے کا فیصلہ، جس کے بارے میں ہمارا خیال تھا کبھی ہوگا ہی نہیں، گرما کے ختم پر ہو ہی گیا، ایک ایسے دن جب اس کی کم سے کم توقع کی جا سکتی تھی: پولینڈ والوں نے، جو گزشتہ سال کی شکست اور اس کے جلو میں آنے والے بھاری ٹیکس قبول کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں تھے، یہ پیغام بھجوایا: ''ٹیکس لینا ہے تو خود آ کر اپنی تلواروں کے ذریعے لو۔'' ابھی حملے کی ترتیب کا نقشہ بن ہی رہا تھا، فوج میں کسی فردِ واحد نے بھی ہتھیار کو صف آرائی میں شامل کرنے کا خیال تک نہیں کیا، اور خوجہ اگلے چند دن طیش سے بھرتا رہا؛ کوئی بھی اس کو بیدہ لوہے کے انبار کے برابر برابر رن میں نہیں جانا چاہتا تھا؛ کسی کو بھی اس لحیم شحیم کیتلی سے کسی فائدے کی توقع نہیں تھی؛ بدتر یہ کہ ان کے خیال میں یہ ایک شگونِ بد تھا۔ مقررہ کوچ سے ایک دن پہلے، جب خوجہ مہم کی فالیں نکال رہا تھا، ہم نے سنا کہ ہمارے دشمن افواہیں پھیلا رہے ہیں اور یہ کھلے بندوں کہا جا رہا ہے کہ ہتھیار اتنی ہی آسانی سے بدبختی لا سکتا ہے جتنی آسانی سے فتح و کامرانی۔ جب خوجہ نے کہا لوگوں کے خیال میں اس بدبختی کا ذمہ دار میں ہوں نہ کہ وہ، تو

مارے دہشت کے میری سٹی گم ہوگئی۔ سلطان نے اعلان کیا کہ اسے خوجہ اور ہتھیار پر اعتماد ہے، اور مزید بحثا بحثی سے گریز کرنے کے لیے حکم دیا کہ معرکہ آرائی کے دوران ہتھیار براہ راست اس کے ساتھ ہوگا، خود اس کی قیادت والے دستے کے ساتھ۔ ستمبر کے آغاز میں، ایک گرم دن، ہم نے اَیدرنہ سے کوچ کیا۔

سب کا یہی خیال تھا کہ فوج کشی کے موسم میں یہ مہم کافی تاخیر سے نکلی ہے، لیکن اس معاملے پر بہت زیادہ حجت نہیں کی گئی: مجھے بس اب یہی معلوم ہو رہا تھا کہ فوجی مہم کے دوران سپاہ نامبارک شگونوں سے بھی اتنے ہی خائف ہوتے ہیں جتنے غنیم سے، بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس خوف سے بھی اتنے ہی برسرِ پیکار تھے۔ پہلی رات، خوش حال دیہاتوں سے ہو کر ہمارے ہتھیاروں کے بوجھ سے کراہتے ہوئے پلوں پر سے شمال کی طرف جاتے ہوئے، سلطان کے خیمے میں حاضری دینے کے بلاوے سے ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ اپنے سپاہ کی طرح، حاکم بھی ناگہانی بچوں جیسا ہوگیا تھا، اس کا انداز ایک ایسے لڑکے جیسا تھا جو کسی نئے کھیل کی ابتدا پر اشتیاق اور ولولہ محسوس کر رہا ہو، اور خوجہ سے پوچھتا، جیسے اس کے لشکری پوچھتے، کہ شگونوں کی وہ کیا تعبیر کرتا ہے: غروبِ آفتاب سے قبل کا سرخ بادل، بہت نیچے نیچے اڑتے ہوئے باز، کسی گاؤں کے مکان کی شکستہ چمنی، جنوب کی طرف پرواز کرتے ہوئے سارس، ان کا کیا مطلب نکلتا ہے؟ ظاہر ہے، خوجہ نے ان سب کی بڑی خوش آئند تعبیر ہی کی۔

لیکن ظاہر ہے ہمارا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا؛ ہم دونوں کو بس اب ہی معلوم ہو رہا تھا کہ دورانِ سفر حاکم رات کے وقت خاص طور پر عجیب و غریب، ڈراؤنی کہانیاں سننا پسند کرتا ہے۔ خوجہ نے ہماری اس کتاب کی جذباتی شاعری سے جو مجھے سب سے زیادہ مرغوب تھی، وہی جو ہم نے سالوں پہلے سلطان کو پیش کی تھی، بھیانک پیکر نکال کر حاضر کیے — بھیانک پیکر جن میں لاشوں، خونین لڑائیوں، شکستوں، غداری اور مصائب کا ہجوم تھا — لیکن اس نے حاکم کی پھٹا سی کھلی آنکھوں کی فتح کے شعلے کی طرف قیادت کی جو اس تصویر کے ایک کونے میں درخشاں تھا: ہمیں چاہیے کہ اس شعلے کو اپنی ذہانت کی دھونکنی سے ہوا دیں، "ان کی اور ہماری" اور اپنے دماغوں میں پوشیدہ سچائیوں کو شرمندۂ تعبیر کریں اور ان تمام چیزوں کو جو خوجہ مجھ سے برسوں کہتا رہا تھا، جنھیں اب میں بھول جانا چاہتا تھا — ہمیں خود کو اپنی خوابیدہ حالت سے جس قدر جلد ہو سکے بیدار کرنا چاہیے! میں ان تلخ قصوں سے اکتانے لگا تھا، لیکن ہر شب خوجہ ان کی ظلمت کو کچھ اور بڑھا دیتا، ان کی بدصورتی کو، ان کی خباثت کو، شاید اس لیے کہ اس کے نزدیک اب خود حاکم کی طبیعت بھی ان کہانیوں سے سیر ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر دیکھا کہ خوجہ کے ہمارے اندرونِ دماغ کا ذکر کرتے ہی سلطان لذت سے کپکپانے لگا ہے۔

ہمارے کوچ کے بعد والے ہفتے شکار کے دورے شروع ہوئے۔ ایک جماعت جو لشکر کے ساتھ خاص اس مقصد سے آئی تھی، آگے جاتی، علاقے کا گشت لگاتی، زراعتی زمین سے گزرتی اور گاؤں والوں، حاکم، ہمیں سب کو جگاتی، مارچ سے کٹ کر شکاری کسی جنگل کی طرف جو اپنے غزالوں کے لیے مشہور ہوتا گھوڑوں کو ایڑ لگاتے، پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چڑھتے جہاں جنگلی خوک دوڑتے پھرتے، یا کسی بن میں جو لومڑیوں اور خرگوشوں سے پٹا ہوتا۔ ان چھوٹی موٹی تفریحی کلیلوں کے بعد، جو گھنٹوں جاری رہتیں، ہم بڑے دھوم دھڑکے سے واپس آ کر مارچ میں شامل ہو جاتے جیسے کسی لڑائی سے فتحیاب لوٹ رہے ہوں، اور جب فوج حاکم کو سلامی دیتی، ہم عین اس کے عقب میں ایستادہ نظارہ کرتے۔ خوجہ ان تکلفاتی رسوم کو تنفر اور برافروختگی سے برداشت کرتا، لیکن میں ان کا متوالا تھا؛ مجھے شام کو سلطان سے مارچ، دیہات جن سے ہو کر لشکر گزرا تھا یا شہروں کی حالت اور غنیم کے تازہ ترین حالات سے زیادہ شکار کے بارے میں گفتگو کرنے میں مزہ آتا۔ پھر خوجہ، اس بک بک سے طیش میں آ کر جسے وہ نہایت احمقانہ اور واہیات سمجھتا تھا، اپنی کہانیاں اور پیش گوئیاں شروع کر دیتا جو ہر گزرتی رات کے ساتھ اپنے تشدد میں فزوں تر ہوتی جاتیں۔ حاکم کے حلقے کے دوسرے لوگوں کی طرح اب خود مجھے بھی یہ دیکھ کر تکلیف ہونے لگی تھی کہ وہ ان قصوں پر اعتبار کرنے لگا ہے جن کا مقصد صرف دہشت پھیلانا تھا، ہمارے دماغ کے تاریک گوشوں کے بارے میں یہ عفریتی کہانیاں۔

لیکن آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا! مجھے تو ابھی اس سے کہیں بدتر کا مشاہدہ کرنا تھا! ہم پھر شکار کر رہے تھے؛ ایک قریبی گاؤں خالی کرالیا گیا تھا، مقامی لوگوں کو سارے جنگل میں بکھیر دیا گیا تھا، تاکہ ٹین کے برتن بجا بجا کر اس شور وغوغا سے خوکوں اور ہرنوں کو ہنکا کر اس مقام پر لے آئیں جہاں ہم اپنے ہتھیاروں اور گھوڑوں سمیت ان کی گھات میں بیٹھے تھے۔ دوپہر کی گرمی سے پیدا ہونے والی تھکن اور بے آرامی سے نجات دلانے کے لیے، حاکم نے خوجہ کو حکم دیا کہ وہ اسے وہ کہانیاں سنائے جو رات کے وقت اس لرزہ براندام کر دیتی ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے، اور دور سے آنے والے ٹین کے برتنوں کا شور بمشکل سنائی دے رہا تھا کہ ایک عیسائی گاؤں کے سامنے آتے ہی وہاں ٹھہر گئے۔ ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ سلطان اور خوجہ ایک خالی مکان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور ایک چمرخ بڈھے کو جو دروازے سے سر نکال رہا تھا آگے آنے کے لیے بہلا پھسلا رہے ہیں۔ کچھ دیر پہلے وہ ''ان کی'' اور ان کے دماغوں کے اندرون کی بابت باتیں کر رہے تھے اور اب، ان کے چہروں کے فسوں کو اور خوجہ کو ترجمان کے ذریعے بوڑھے سے کچھ پوچھتے دیکھ کر، میں قریب آیا، جو ہونے والا تھا اس کے اندیشے سے خائف۔ خوجہ بڈھے سے سوال کر رہا تھا اور اس سے بغیر سوچے فوری جواب دینے کا مطالبہ بھی: اس کا بڑے سے بڑا جرم کیا تھا، بدترین چیز جس کا اس نے زندگی میں ارتکاب کیا تھا؟ گاؤں والا، سلاوی لہجے میں، جس کا ترجمہ کرنے میں ترجمان کو خاصی دقت ہوئی، بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑایا کہ وہ ایک نردوش، معصوم بوڑھا آدمی ہے؛ لیکن خوجہ خاصی شدت سے اس پر اڑا رہا کہ وہ ہمیں اپنے بارے میں بتائے۔ صرف اسی وقت جب بڈھے نے دیکھا کہ حاکم اس کی طرف متوجہ ہے، اس نے اعتراف کیا کہ اس نے گناہ کیا ہے: ہاں، وہ مجرم ہے، دوسرے گاؤں والوں کی طرح اسے بھی اپنے مکان سے باہر نکل آنا چاہیے تھا، اپنے بہن بھائیوں کی طرح اسے بھی لازم تھا کہ شکار میں شامل ہو کر جانوروں کا تعاقب کرتا، لیکن وہ بیمار ہے، اس کے پاس جواز موجود ہے، وہ تندرست نہیں کہ سارا دن جنگل میں دوڑتا پھرے، اور جب اس نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا، عذرخواہی کے طور پر، خوجہ آپے

سے باہر ہو گیا اور برسا کہ وہ اس کی حقیقی معصیتوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے، اس کے بارے میں نہیں۔ بہرکیف، ترجمان کے متعدد بار دہرانے کے باوجود، سوال بڈھے کی سمجھ میں نہیں آیا، بس غمگینی سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر دباتا رہا، دنگ کہ اور کیا کہے۔ وہ بڈھے کو پکڑ کر لے گئے۔ اگلے دن جب ایک اور آدمی کو پکڑ لائے اور اس نے بھی یہی سب کہا، تو خوجہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ اس نے اس دوسرے گاؤں والے سے میرے بچپن کی تقصیروں کا ذکر کیا، جھوٹ جو میں نے اپنے بھائی بہنوں کے مقابلے میں زیادہ چاہے جانے کے لیے گھڑے تھے، یونی ورسٹی کی طالبِ علمی کے زمانے کی جنسی لغزشیں جو مجھ سے سرزد ہوئی تھیں، گویا فسق و فجور کی مثالیں دے کر وہ کسی بے نام گنہگار کی فردِ جرم سے گاؤں والے کو تحریک دلانا چاہتا ہو۔ جب کہ میں کھڑا سنتا رہا، تنفر اور ندامت سے ان دنوں کو یاد کرتا رہا جو ہم نے طاعون کے زمانے میں ساتھ گزارے تھے لیکن جن کی بازخوانی اب، یہ کتاب لکھتے وقت، میں نہایت آرزومندی سے کر رہا ہوں۔ جب آخری گاؤں والے کو، جو ایک اپاہج تھا، باہر لائے، تو اس نے سرگوشی میں اعتراف کیا اس نے دریا میں نہاتی ہوئی عورتوں کا چھپ کر نظارہ کیا ہے، تو کہیں جا کر خوجہ کا جلال کسی قدر فرو ہوا۔ ہاں، تم نے دیکھا، جب ان کا سامنا ان کے گناہوں سے کرایا جاتا ہے تو ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے، وہ ان سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں؛ لیکن ہم، جواب قیاساً یہ جان گئے ہیں کہ ہمارے دماغوں کے گوشوں میں کیا کچھ پیش آتا ہے، وغیرہ، وغیرہ۔ میں یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ سلطان متأثر نہیں ہوا ہے۔

لیکن اس کی دلچسپی چمک گئی تھی؛ دو دن بعد، ہرن کے شکار کی ایک اور مہم کے دوران اس نے اس ناٹک کی تکرار پر اپنی آنکھیں بند کر لیں، شاید اس لیے کہ اس میں خوجہ کے اصرار کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ ہو، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس بازپرس سے میرے اندازے سے کہیں زیادہ لطف اٹھایا ہو۔ اب ہم ڈینیوب پار کر چکے تھے؛ ایک بار پھر ہم ایک عیسائی گاؤں میں تھے۔ جہاں تک ان سوالوں کا تعلق ہے جو خوجہ نے گاؤں والوں پر داغے، تو ان میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے میرے لیے طاعون کی راتوں کی اس جارحیت کی یاد کو

تازہ کردیا جب میں اس سے اس کے گناہوں کو لکھوانے میں کامیاب ہوجاتا، اور پہلے پہل تو میں گاؤں والوں کے جواب سننے کا بھی روادار نہیں تھا، جو سوالوں اور سوال کرنے والوں دونوں سے بری طرح ہراساں تھے، یہ گم نام قاضی جس کا سلطان درپردہ حامی تھا۔ میں ایک عجیب سی مالش سے مغلوب ہوگیا؛ خوجہ سے زیادہ پُرتقصیر میں نے سلطان کو گردانا، جو یا تو خوجہ کے فریب میں آ گیا تھا یا اس شیطانی کھیل کی کشش سے خودکو باز رکھنے کا نااہل تھا۔ لیکن خود مجھے بھی اس کشش کی گرفت میں آجانے میں دیر نہیں لگی؛ سننے میں آدمی کا کچھ نہیں جاتا، میں نے سوچا، اور ان سے قریب ہوگیا۔ زیادہ تر معاصی اور بدکاریاں، جن کا اظہار اب بڑی نفیس زبان میں ہوتا جو میرے کانوں کو بہت بھاتی، ایک دوسرے سے مشابہت رکھتیں: سیدھے سادے دروغ، چھوٹے موٹے فریب؛ ایک دو واقعتاً غلیظ چارسوبیسیاں، دو ایک جنسی بے وفائیاں؛ زیادہ سے زیادہ، چند ادنیٰ سی چوریاں۔

شام کو خوجہ نے کہا کے گاؤں والوں نے ہر بات فاش نہیں کی ہے، وہ سچ کو چھپائے ہوئے ہیں؛ اپنی تحریروں میں میں اس سے کہیں آگے نکل گیا تھا: وہ ضرور کہیں زیادہ گھنونے، کہیں زیادہ حقیقی گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے جو انھیں ہم سے الگ کرتے ہیں۔ سلطان کو قائل کرنے کے لیے، ان سچائیوں تک رسائی کے لیے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ''وہ'' اور، بنابریں، ''ہم'' کس قسم کی مخلوق ہیں، اگر ضرورت پڑی تو وہ تشدد کا استعمال کرے گا۔

یہ کراہت آمیز جارحیت ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ زہریلی اور بے مقصد ہوتی گئی۔ شروع میں ہر چیز بے حد سادہ تھی؛ ہم کھیل میں مگن بچوں کی طرح تھے، جو کھیل کے درمیانی وقفوں میں پھکّڑ تاہم بے ضرر سا مذاق کررہے ہوں؛ بازپرس کی ہر ساعت ایک ڈرامے کے مختلف ایکٹوں کے درمیان والے مختصر، ہلکے پھلکے طنزیہ چٹکلوں کی طرح تھی جن میں ہم اپنی پرلطف طویل شکاری مہمات سے ستا رہے ہوتے؛ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ ان رسومات میں تبدیل ہوگئیں جنھوں نے ہماری ساری قوتِ ارادی کو نچوڑ لیا، ہمارے صبر، ہماری دلیری کو، لیکن جن سے، خدا جانے کیوں، ہم دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ میں دیکھتا

کہ خوجہ کے سوالات اور اس کے ناقابلِ فہم طیش سے گاؤں کے لوگ کس طرح دہشت سے دم بخود رہ جاتے؛ اگر ان کی سمجھ میں آجاتا کہ کیا پوچھا جارہا ہے تو شاید وہ تعمیل کرسکتے: میں نے پوپلے منھ اور تھکے ماندے بوڑھوں کو دیکھا کہ گاؤں کے چوراہے کی طرف ریوڑ کی طرح ہنکائے جارہے ہیں؛ قبل اس کے کہ وہ ہکلا ہکلا کر اپنی، حقیقی یا فرضی، بدکاریوں کا اعتراف کریں، وہ اپنے آس پاس والوں سے مدد کی بھیک مانگتے، ہم سے بھی، ایسی نگاہوں سے جن میں امید کا شائبہ بھی نہ ہوتا؛ میں نے نوجوانوں کو دیکھا کہ رگیدے جارہے ہیں، پچھاڑے جارہے ہیں اور دوبارہ کھڑے ہوجانے پر مجبور کیے جارہے ہیں کیونکہ ان کے اعترافات اور معاصی اطمینان بخش نہیں پائے گئے تھے: مجھے یاد رہے گا کہ کس طرح خوجہ نے جو میں نے میز پر بیٹھ کر قلمبند کیا تھا اسے پڑھتے ہوئے کہا تھا، ''بدمعاش،'' اور میری پیٹھ پر گھونسا مارا تھا، بڑبڑاتے اور اس پریشانی کے مارے پاگل ہوتے ہوئے کہ یہ اس کی سمجھ سے باہر ہے کہ میں ایسا کیسے ہوسکتا ہوں۔ لیکن اب جس چیز کا متلاشی تھا اس کو بہتر طور پر جانتا بھی تھا، ان نتائج کو جن تک پہنچنا چاہتا تھا، اگرچہ بے کم و کاست نہ بھی سہی۔ اس نے دوسرے ذرائع بھی استعمال کیے: بیس مرتبہ وہ گاؤں والے کو بیچ میں ٹوک کر اصرار کرتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؛ بعد ازاں ہمارے آدمی خطاوار کا بھرکس نکال دیتے۔ دوسرے موقعوں پر وہ آدمی کی بات کاٹتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ اس کے ایک رفیق نے اس کی تردید کی ہے۔ کچھ دیر تک وہ انھیں دو دو کرکے آگے بلاتا رہا۔ جب دیکھا کہ اعترافات اوپری ہیں، اور گاؤں والے ایک دوسرے کے سامنے شرمندہ ہورہے ہیں، اس کے باوجود کہ ہمارے آدمیوں نے بڑی مقصدیت سے ان کے ساتھ تشدد کا استعمال کیا ہے، تو وہ طیش میں آجاتا۔

بے رحم موسلا دھار بارشیں شروع ہونے کے وقت تک میں بھی جو ہورہا تھا اس کا تقریباً خوگر ہوچکا تھا۔ مجھے گاؤں والے یاد ہیں جنھوں نے بہت کم کہا، اور بہت زیادہ کہنے کی جنھیں کم تر خواہش تھی، کہ انھیں بے سود زدوکوب کیا جارہا ہے، ایک گاؤں کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے چوک میں ساعت بعد ساعت بھیگتے کھڑے رہنے اور انتظار کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ وقت

کے گزران کے ساتھ شکار کی کششیں محو ہونے لگیں اور ہماری مہمات قبل از وقت ختم کردی گئیں۔ کبھی کبھار ہم ایک آدھ غمگین چشم غزال یا فربہ جنگلی خوک مارتے، جس سے سلطان رنجیدہ ہوجاتا، لیکن اب ہماری توجہ شکار کی تفصیلات میں نہیں بلکہ ان احتسابوں پر لگی ہوئی تھی جن کی تیاریاں، شکار کی تیاریوں کی طرح، بہت پہلے ہی شروع ہوچکی ہوتیں۔ رات کے وقت، گویا دن بھر جو کرتا رہا ہے اس پر خود کو مجرم محسوس کررہا ہو، خوجہ اپنے جذبات کا مجھ سے برملا اظہار کرتا۔ وہ خود بھی جو کچھ ہورہا تھا اس سے پریشان ہے، تشدد سے، لیکن وہ کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے، وہ کچھ جو ہم سب کے لیے سود مند ہوگا: وہ اس کا مظاہرہ سلطان کے لیے بھی کرنا چاہتا ہے؛ اس کے علاوہ یہ کہ گاؤں والے آخر کیوں سچ کی پردہ پوشی کررہے ہیں؟ بعد میں اس نے کہا کہ مقابلے کے لیے ہمیں یہی تجربے کسی مسلمان گاؤں میں بھی کرنے چاہئیں؛ لیکن اس سے وہ نتائج حاصل نہیں ہوے جن کی اسے آس تھی: اگرچہ اس نے ان کی باز پرس میں کم تر جبر سے کام لیا، انھوں نے کم و بیش ویسے ہی اعترافات کیے جو ان کے عیسائی ہمسایوں نے کیے تھے۔ یہ ان منحوس دنوں میں کا دن تھا جب بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی ہے، خوجہ چند لفظ بڑبڑایا جن سے مراد تھی کہ یہ لوگ سچے مسلمان نہیں ہیں، لیکن جب شام کو دن کے واقعات پر بحث ہوئی تو میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ اسے احساس ہوگیا ہے کہ یہ صداقت سلطان کی توجہ سے بھی مستور نہیں رہی ہے۔

اس دریافت نے خوجہ کی برہمی کو اور ہوا دی اور اسے اور زیادہ تشدد کے استعمال پر مجبور کیا، اتنا تشدد کہ اگرچہ سلطان اس کے مشاہدے کا متحمل نہیں تھا تاہم اس کا مریضانہ تجسس سے اتباع کرتا رہا۔ جوں جوں ہم اور زیادہ شمال کی طرف بڑھتے گئے ایک بار پھر ایک جنگلی علاقے سے دوچار ہوے جہاں گاؤں والے سلاوی کی ایک بولی بول رہے تھے؛ ایک قدیم وضع کے چھوٹے سے گاؤں میں ہم نے خوجہ کو خود اپنی مٹھیوں سے ایک خوب رو نوجوان کو زدوکوب کرتے دیکھا جو صرف ایک بچکانہ جھوٹ سے زیادہ کچھ یاد نہیں کرسکا تھا۔ خوجہ نے قسم کھائی کہ دوبارہ ایسا کبھی نہیں کرے گا؛ شام پڑتے پڑتے وہ احساسِ جرم سے اتنا مغلوب ہوگیا تھا کہ یہ

مجھے ضرورت سے زیادہ لگا۔ ایک اور موقعے پر، جب ایک گدلا سا مینھ برس رہا تھا، میں نے ایک گاؤں کی عورتوں کو دور سے ان کے مردوں پر جو گزر رہی تھی اس پر آنسو بہاتے ہوے دیکھا۔ ہمارے سپاہی تک، جو اپنے کام میں ماہر ہوگئے تھے، جو ہورہا تھا اس سے بیزار ہوگئے تھے؛ بعض اوقات وہ ہم سے پہلے ہی اعتراف کروانے کے لیے اگلے آدمی کا انتخاب کرکے اسے آگے لاتے، اور خوجہ کے بجاے، جو اپنے غیظ و غضب کے باعث واماندہ نظر آنے لگا تھا، ہمارا ترجمان خود ہی اولین باز پرس کرتا۔ یہ نہیں کہ ہمارا سابقہ دلچسپ مصیبت زدوں سے کبھی پڑتا ہی نہ ہو جو اپنی معصیتوں کا بڑا طولانی ذکر کرتے ہوں، جیسے اپنے قلب کی گہرائیوں میں زمانوں سے باز پرس کے ایسے ہی کسی دن کے منتظر ہوں، جو یا تو ہمارے جبر و تعدّی کے قصوں سے، جو ہم نے سنا تھا گاؤں گاؤں پھیل کر ایک افسانوی روایت بن گئے تھے، یا کسی عدلِ مطلق کے عفریت سے جس کے اسرار تک ان کی رسائی ممکن نہ تھی، دہشت زدہ عقل دنگ ہوگئے تھے؛ لیکن اب خوجہ کو زن و شو کی جنسی بیوفائیوں میں، اور مفلس و نادار دیہاتیوں کی اپنے متمول ہمسایوں سے رقابت میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ مسلسل یہی تکرار کرتا کہ ایک عمیق سچائی ہے، لیکن کبھی کبھار اسے شک ہوتا، جیسا کہ ہمیں ہوتا، کہ ہم کبھی اسے دریافت کرسکیں گے۔ یا کم از کم اسے ہمارے شک کا احساس ہوجاتا اور غصے سے بھڑک اٹھتا، لیکن سلطان اور ہم یہی خیال کرتے کہ ہار ماننے کی اس کی کوئی نیت نہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہم راضی برضا تماشائی بن گئے، جو عنان کو اس کے قابو میں دیکھنے ہی پر قناعت کرتے۔ ایک مرتبہ، ناگہانی شدید بارش سے ایک چھت کے چھجے کے نیچے پناہ لے کر، اس منظر سے ہماری امید بندھی کہ خوجہ اپنی کھال تک پانی میں شرابور ایک نوجوان پر سوالات کی بوچھار کیے جا رہا ہے جو اپنے سوتیلے باپ اور بہن بھائیوں سے اپنی ماں سے بدسلوکی کرنے پر نفرت کرتا تھا؛ لیکن بعد میں شام کو اس نے یہ دفتر یہ کہہ کر بند کردیا کہ یہ بھی ایک عام سا نوجوان ہے جو یاد رکھنے کے قابل نہیں۔

ہم شمال اور اس سے بھی زیادہ شمال کی طرف بڑھتے رہے؛ مارچ، اونچے پہاڑوں سے بل کھاتی ہوئی، کچھوے کی رفتار سے تاریک جنگلوں کے کیچڑ آلود راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی۔

سفیدے اور زان سے اَٹے ہوئے بنوں سے آتی ہوئی ٹھنڈی اور تاریک ہوا مجھے بڑی فرحت بخش معلوم ہوئی، کہرائی خموشیاں جو شکوک کو ابھارتیں، ہر چیز دھندلی دھندلی سی۔ اگرچہ کسی نے نام نہیں لیا، میرا خیال ہے ہم کارپاتھین پہاڑوں کی ترائی میں پہنچ گئے تھے، جو میں نے اپنے بچپن میں اپنے باپ کے پاس یورپ کے ایک نقشے میں دیکھے تھے، وہ جسے واجبی صلاحیت کے کسی آرٹسٹ نے بنایا تھا اور جس نے اسے ہرنوں اور گوتھک طرز کے قلعہ نما محلوں سے مزین کیا تھا۔ بارش کی وجہ سے خوجہ کو سردی لگ گئی تھی اور بیمار پڑا تھا، ہم پھر بھی ہر صبح جنگل میں جاتے، مارچ سے کٹ کر جو ایک راستے پر رینگ رہی تھی جو یوں بل کھاتا گویا کبھی انتہا تک پہنچنے کو ملتوی کرنا چاہتا ہو۔ لگتا تھا اب ہم شکاری مہمات کو بھول بھال گئے ہیں: یہ گویا یوں تھا کہ ہم کسی جھیل کے کنارے یا عمودی ڈھلان کی حد پر ٹھہرے ہوئے ہوں، ہرن مارنے کے لیے نہیں بلکہ گاؤں والوں کو، جو ہمارے لیے تیاری کر رہے ہوں، اور زیادہ انتظار کروانے کے لیے! جب ہم فیصلہ کرتے کہ وقت آ گیا ہے، تو کسی ایک گاؤں میں داخل ہو جاتے، اور اپنی رسومات کی تکرار کے بعد خوجہ کے پیچھے پیچھے ہو لیتے جو کسی دوسرے گاؤں کی طرف ہمیں بہ عجلت لے جا رہا ہوتا، جس خزانے کا متلاشی تھا اس کو پانے میں ہمیشہ ناکام لیکن بڑی بے جگری سے انھیں فراموش کر دینے کا جو یا جن کے ساتھ دھینگا مشتی کی ہوتی اور جن کی مار کٹائی، اور اپنی یاس کو فراموش کر دینے کا بھی۔ ایک موقعے پر اس نے ایک تجربہ کرنا چاہا: سلطان نے، جس کے صبر نے مجھے ششدر کر دیا تھا، بیس ینی چری کو اس تجربے کے لیے بلوایا؛ اس نے پہلے ان سے بھی یہی سوال کیے، اور بعد میں سفید بالوں والے گاؤں کے باسیوں سے جو گم سم اپنے گھروں کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک اور موقعے پر وہ گاؤں والوں کو مارچ تک لایا، ہمارا چرخ چوں کرتا ہوا ہتھیار جسے کیچڑ سے لت پت راستوں پر حاکم کی فوج کا ساتھ دینے میں بڑی شدید محنت کرنی پڑ رہی تھی، پوچھا کہ اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے اور منشی سے ان کے جوابات قلمبند کروائے، لیکن اس کی طاقت جواب دے گئی۔ شاید یہ اس لیے تھا، جیسا کہ وہ دعوے دار تھا، کہ ہمیں سچ کا اور جھوٹ بھی معلوم نہیں، یا شاید وہ خود بھی اس بے معنیٰ تشدد سے ڈر ڈرا گیا تھا، شاید

یہ وہ احساسِ جرم تھا جو رات کے وقت اس پر غالب آ جاتا ہو، یا اس لیے کہ فوج اور پاشاؤں کو ہتھیار اور جنگلوں میں ہونے والی وارداتوں کی بابت ناپسندیدگی سے بڑبڑاتے سن کر اس کی طبیعت اوبھ گئی ہو، یا شاید صرف اس لیے کہ وہ علیل تھا، مجھے نہیں معلوم: اس کی گلوگرفتہ آواز میں پہلے جیسی گونج نہیں رہی تھی؛ وہ سوال جن کے جواب اسے زبانی یاد تھے انھیں پوچھنے میں اس کا سابقہ جوش و خروش جاتا رہا تھا؛ شام کے وقت جب وہ فتح کا ذکر کرتا، مستقبل کا، اس کا کہ ہمیں کس طرح بیدار ہو کر خود کو بچانا چاہیے، تو یوں لگتا کہ خود اس کی آواز کو، جو وقت کے ساتھ ساتھ کم زور پڑتی جا رہی تھی، جو وہ کہہ رہا تھا اس پر یقین نہیں تھا۔ اس کا وہ آخری پیکر جو میری یادداشت میں محفوظ ہے اس میں وہ چند بھونچکے سلاوی دیہاتیوں سے اوپرے دل سے بازپرس کر رہا ہے دریں اثنا ایک گندھک رنگ دھویں جیسی برسات بس دوبارہ شروع ہو رہی ہے۔ ہم مزید نہیں سننا چاہتے تھے اور ان سے دور کھڑے رہے؛ خواب ناک روشنی کے پار، جسے پانی نے پھیلا دیا تھا، ہم نے انھیں طلاکاری کے چوکھٹے میں جڑے بھاری بھرکم آئینے کی بھیگی سطح کو خالی خالی نظروں سے تکتے ہوئے دیکھا جو خوجہ انھیں باری باری پکڑا رہا تھا۔

ہم ان ''شکاری'' مہمات پر دوبارہ نہیں گئے: ہم نے دریا پار کر لیا تھا اور پولس کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمارا ہتھیار راستوں پر بالکل آگے نہ بڑھ سکا جو غلیظ بارش میں کیچڑ سے لتھڑ گئے تھے، اور روز بروز بھاری ہوتا جا رہا تھا، اور اب جب کہ مارچ کو بہ سرعت آگے بڑھنے کی ضرورت تھی، اور سست رو کیے دے رہا تھا۔ اسی وقت یہ افواہیں کثرت سے پھیلنے لگیں کہ کس طرح ہماری محاصرے کی مشین — جس کے خلاف پاشا پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے — ہم پر بدبختی، حتیٰ کہ قہرِ الٰہی، لائے گی؛ اور ینی چری کی کانا پھونسیوں نے، جنھوں نے خوجہ کے ''تجربوں'' میں شرکت کی تھی، انھیں اور بھی چٹ پٹا بنا دیا۔ ہمیشہ کی طرح، یہ خوجہ نہیں تھا بلکہ میں، ایک کافر، جسے انھوں نے موردِ الزام ٹھہرایا۔ جب خوجہ اپنی بک بک شروع کرتا، جس میں شعر کے خمیر کی ملاوٹ سے اب خود سلطان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا، اور ہتھیار کی ناگزیریت کا ذکر کرتا، غنیم کی طاقت کا، کہ کس طرح ہمیں جوش میں آ کر عمل پر آمادہ ہونا

چاہیے، تو حاکم کے خیمے میں مجتمع پاشاؤں کو یہ سب سن کر اور وثوق ہو جاتا کہ ہم ڈھکوسلے باز ہیں اور ہمارا ہتھیار بدبختی لا کر رہے گا۔ وہ خوجہ کو ایک روگی سمجھتے جو راہ سے بھٹک گیا ہو لیکن جسے بچایا جاسکتا ہو؛ صحیح معنوں میں خطرناک، صحیح معنوں میں مجرم تو میں تھا، جس نے خوجہ اور حاکم کو فریب دیا تھا اور یہ بدشگون منصوبے تراشے تھے۔ رات کو جب ہم اپنے خیموں میں چلے جاتے تو خوجہ اپنی تباہ شدہ آواز میں ان پاشاؤں کو بے نقط سناتا جس طرح ماضی میں اپنے احمقوں کی زجر و توبیخ کیا کرتا تھا، لیکن ان برسوں میں جس مسرت اور امید کو میرا خیال تھا ہم زندہ رکھ سکے تھے اس کا کہیں دور دور نام و نشان بھی باقی نہیں بچا تھا۔

بہرکیف، میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہنوز دست کش ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ دو دن بعد، جب ہمارا ہتھیار مارچ کے بیچوں بیچ کیچڑ میں پھنس گیا، میری رہی سہی امید بھی رخصت ہوگئی؛ لیکن خوجہ مسلسل کوشش کرتا رہے، بیماری کے باوجود۔ کوئی ہماری مدد کے لیے ایک آدمی بھی دینے کو تیار نہ تھا، ایک گھوڑا تک؛ وہ سلطان کے پاس گیا اور تقریباً چالیس گھوڑے لے آیا، انھیں توپ سے، جس میں جُتے تھے، آزاد کروایا، اور آدمیوں کی ایک جماعت اکٹھا کی؛ شام ہونے تک، ٹھیک ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سارا دن زور مارنے کے بعد جو دعا کر رہے تھے کہ یہ کیچڑ میں اور گڑ جائے، اس نے بپھر کر گھوڑوں پر بری طرح کوڑے برسانے شروع کیے اور ہمارے عفریتی کیڑے کو حرکت دی۔ وہ شام اس نے پاشاؤں سے بحثا بحثی میں گزاری، جو ہم اور ہمارے ہتھیار سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور بولے کہ یہ فوج کی ساری قوت نچوڑے لے رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بدبختی بھی لا رہا ہے، لیکن مجھے احساس ہوگیا کہ اسے فتحیابی پر اب اور یقین نہیں رہا ہے۔

اس شب جب میں نے ہمارے خیمے میں عود پر، جو میں فوجی مہم پر ساتھ لے آیا تھا، کچھ بجانے کی کوشش کی تو خوجہ نے اسے میرے ہاتھ سے جھپٹ کر ایک طرف پھینک دیا۔ کیا مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے سر کے خواہاں ہیں؟ مجھے معلوم تھا۔ بولا کہ اگر وہ میرے سر کے بجائے اس کے سر کا مطالبہ کرتے تو اسے اس سے زیادہ خوشی ہوتی۔ اس کا بھی مجھے علم تھا، لیکن

میں خاموش رہا۔ میں دوبارہ اپنا عود اٹھانے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے روک دیا، بولا کہ اسے اس مقام کے بارے میں اور کچھ بتاؤں، اپنے وطن کے بارے میں۔ جب میں نے ایک دو من گھڑت قصے سنا دیے، جیسے حاکم کو سنائے تھے، تو وہ خفا ہوگیا۔ وہ سچ کا خواستگار تھا، عین مین جو پیش آیا تھا اس کا: اس نے میری ماں، میری منگیتر، میرے بھائیوں اور بہنوں کی بابت پوچھا۔ جب میں نے ''سچ'' بیان کرنا شروع کیا تو وہ بھی شامل ہوگیا، وہ اطالوی لفظ، جو مجھ سے سیکھے تھے، بھرّائی ہوئی آواز میں بڑبڑا دیے، مختصر، نامکمل فقرے جن سے میں کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔

اگلے چند دنوں میں، جب اس نے تباہ شدہ دفاعی مورچہ بندیاں دیکھیں جن پر ہمارے ہراول دستوں نے قبضہ کرلیا تھا، تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بڑی مایوسی کے عالم میں عجیب قسم کے گھناؤنے خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک صبح جب ہم ایک گاؤں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے جو ہماری توپوں کے گولوں کی زد میں آ گیا تھا، تو وہ ایک دیوار کے دامن میں زخمیوں کو کرب کے عالم میں مرتے دیکھ کر گھوڑے سے اتر گیا اور دوڑ کر ان کی طرف گیا۔ فاصلے سے دیکھتے ہوئے پہلے مجھے خیال ہوا کہ وہ ان کی مدد کرنا چاہتا ہے، گویا اگر ترجمان ساتھ ہوتا تو وہ ان سے ان کے زخموں کا حال پوچھتا؛ پھر میں نے جان لیا کہ وہ ایک ایسے جوش کی گرفت میں ہے جس کی وجہ میں محسوس کرسکتا ہوں؛ وہ ان سے کوئی اور بات پوچھنا چاہتا تھا۔ اگلے روز جب ہم حاکم کے ساتھ تباہ و برباد مورچہ بندیوں اور سڑک کے دو رویہ چھوٹے چھوٹے میناروں کے معائنے کے لیے گئے، تو وہ ابھی تک اسی مشتعل حالت میں تھا: اس کی نظر ایک زخمی آدمی پر جا پڑی جس کا سر ابھی تک جسم سے جدا نہیں ہوا تھا اور جو کاملاً مسمار عمارتوں اور گولہ باری سے چھلنی چوبی سدّ راہوں کے درمیان پڑا تھا، اور اس کی طرف دوڑ پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے آیا، تاکہ اسے کوئی اوچھی حرکت کرنے سے باز رکھوں، اس سے خوفزدہ کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے ہی اسے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے، یا شاید محض گرے ہوئے تجسس کے باعث۔ گویا اس کو یقین تھا کہ زخمی، جن کے جسم قذیفوں اور توپ کے گولوں سے تار تار ہوگئے ہیں،

موت کا نقاب منھ پر تاننے سے پہلے اسے کچھ بتا سکیں گے؛ خوجہ ان سے استفسار کرنے کے لیے تیار تھا تا کہ وہ یہ اس پر افشا کردیں؛ وہ ان سے وہ عمیق سچائی معلوم کرے گا جو ایک آن میں سب کچھ بدل کر رکھ دے گی، لیکن میں نے دیکھا کہ موت سے قریب ان چہروں کی مایوسی میں اسے خود اپنی مایوسی نظر آ رہی ہے، اور جب ان سے قریب ہوا تو کچھ بول نہ سکا۔

اس دن جھٹ پٹے کے وقت، یہ معلوم کر کے کہ حاکم اس بات پر بپھرا ہوا ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود دوپیو کے قلعے پر قبضہ نہیں ہوسکا ہے، خوجہ سلطان کے پاس اسی جوش و خروش کی حالت میں گیا۔ جب لوٹا تو خائف تھا، لیکن کیوں خائف تھا یہ نہیں معلوم تھا۔ اس نے سلطان سے کہا تھا کے وہ اپنا ہتھیار میدان جنگ میں اتارنے کا خواہشمند ہے، کہ صرف اسی دن کے واسطے وہ برسوں اس پر عرق ریزی کرتا رہا ہے۔ حاکم نے، میری توقع کے برخلاف، اقرار کیا کہ ہاں وقت آ گیا ہے، لیکن یہ ضروری سمجھا کہ سنہری بالوں والے حسین پاشا کو کچھ اور مہلت دینے کا فیصلہ کرے، جسے اس نے قبل ازیں قلعے پر دھاوا بولنے پر مأمور کیا تھا۔ حاکم نے یہ کیوں کہا؟ یہ ان سوالوں میں سے ایک ہے جس کے بارے میں برسوں مجھے کبھی ٹھیک سے یقین نہیں ہوسکا کہ یہ خوجہ نے مجھ سے پوچھا تھا یا خود اپنے سے؛ کسی وجہ سے اب میں مزید خود کو اس سے قریب نہیں محسوس کر رہا تھا، اس پریشانی سے میں بھر پایا تھا۔ خوجہ نے خود ہی سوال کا جواب دے دیا: اس لیے کہ انھیں اس بات کا خوف تھا کہ فتح کے کچھ حصہ میں کہیں وہ بھی شریک نہ ہوجائے۔

اگلی دوپہر تک، جب ہمیں اطلاع ملی کہ سنہری بالوں والا حسین پاشا ہنوز قلعہ فتح نہیں کرسکا ہے، خوجہ نے اپنی ساری طاقت خود کو یہ باور کرانے میں لٹا دی کہ اس کا گمان درست تھا۔ جب سے یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ میں ایک بدبخت جاسوس ہوں، میں نے حاکم کے خیمے میں جانا بند کردیا تھا۔ اس رات جب خوجہ دن کے واقعات کی تعبیر کرنے گیا، تو فتح اور خوش قسمتی کے قصے سنائے جن پر لگتا ہے سلطان کو یقین آ گیا تھا۔ جب وہ ہمارے خیمے لوٹا تو اس نے اس آدمی کا رجائی انداز اختیار کیا ہوا تھا جسے اعتماد ہو کہ آخر میں وہ شیطان کی ٹانگیں

توڑ کر ہی رہے گا۔ اس کو سنتے ہوئے میں اس کی رجائیت کے مقابلے میں اس کی شدید کوشش سے زیادہ متأثر ہوا جو وہ بظاہر اسے قائم رکھنے کے لیے کر رہا تھا۔

اس نے وہی قدیم ''ہماری'' اور ''ان کی'' کہانی دہرائی، آنے والی فتح کی، لیکن اس کی آواز میں ایک ایسی دل گرفتگی آ گئی تھی جو مجھے پہلے کبھی سنائی نہیں دی تھی، جو کسی افسردہ لے کی طرح ان کہانیوں کی ہمرہی کر رہی تھی؛ یوں جیسے وہ بچپن کی کسی یاد کا ذکر کر رہا ہو جس سے ہم دونوں ہی بخوبی واقف ہوں کیونکہ ہم ایک پوری زندگی میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔ میں نے جب اپنا عود اٹھایا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اور نہ اس وقت جب میں نے عود کے تاروں کو اَن گھڑ پنے سے چھیڑا: وہ مستقبل کا ذکر کر رہا تھا، وہ شاندار دن جن سے ہم دریا کے دھاروں کا رخ حسبِ منشا موڑ کر لطف اندوز ہوں گے، لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ ماضی کا ذکر کر رہا ہے: آسودگی کے رؤیا میری آنکھوں کے سامنے تیر گئے، کسی گھر کے الگ تھلگ پائیں باغ میں کوئی پروقار درخت، روشنی سے جگمگاتے گرم کمرے، ڈنر ٹیبل کے گرد ایک پرمسرت گھرانے کا ہجوم۔ برسوں میں پہلی مرتبہ اس نے مجھے آسودگی کا احساس دلایا؛ میں سمجھ گیا کہ یہ کہتے ہوئے کہ یہ سب چھوڑنا بڑا کٹھن ہوگا، کہ اسے یہاں کے لوگوں سے محبت ہے، وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔ پھر، کچھ دیر کے لیے ان لوگوں پر غور کرتے ہوئے، اسے اپنے احمق یاد آ گئے اور غصے سے بھڑک اٹھا، اور میں نے سوچا کہ وہ حق بجانب ہے۔ ایسا لگا کہ اس کی رجائیت محض ایک تصنع نہیں؛ شاید اس لیے کہ یہ احساس کہ ایک نئی زندگی بس شروع ہونے ہی والی ہے ایک ایسی چیز تھی جس میں ہم دونوں شریک تھے، یا اس لیے کہ مجھے خیال آیا کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو خود بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرتا، خدا جانے۔

اگلی صبح جب ہم نے محاذ سے قریب غنیم کی ایک چھوٹی سی مورچہ بندی کہ خلاف اپنا ہتھیار آزمانے کے لیے میدان میں اتارا، تو ہم دونوں کو ایک ہی جیسا پراسرا پیشگی احساس تھا کہ یہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے گا۔ ہتھیار کے پہلے حملے ہی میں وہ سو آدمی جو حاکم نے ہماری مدافعت کے لیے مہیا کیے تھے صف بندی توڑ کر تتر بتر ہوگئے۔ چند خود ہتھیار کے نیچے

باڑھ ایک متعفن دلدل چھوڑ گئی ہے، اور پیادہ فوج، گو اس نے دلدلی علاقہ ضرور عبور کرلیا تھا، سخت کوشش، اور توپوں کی گولہ باری کی امداد کے باوجود ڈھلان پر کسی طرح نہ چڑھ سکی، تو میں نے اس سڑک کا خیال کیا جو ہمیں یہاں لائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز اتنی ہی کامل ہے جتنا اس خالص ترین سفید قلعے کا منظر جس کے برجوں کے اوپر پرندے اڑتے پھر رہے تھے، اتنی کامل جتنی سیاہ پڑتی ہوئی ڈھلان کی کھڑی چٹان اور ساکت و صامت، تاریک جنگل۔ اب میں یہ جان گیا تھا کہ وہ تمام چیزیں جو برسوں میرے تجربے میں اتفاقی طور پر آتی رہی تھیں، دراصل ناگزیر تھیں، کہ ہمارے سپاہ کبھی بھی قلعے کے سفید برجوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، کہ خوجہ بھی ٹھیک یہی سوچ رہا ہے۔ ہمیں پتا تھا کہ صبح جب ہمارا ہتھیار محاصرے میں شامل ہوگا تو دلدل میں دھنس کر رہ جائے گا، اپنے اندر اور اپنے اطراف میں ہمارے سپاہ مرنے کے لیے چھوڑ کر، کہ نتیجے میں آوازیں اٹھیں گی جو بدبختی کی افواہوں، خوف، اور سپاہیوں کے شکوے شکایات کو خاموش کرنے کے واسطے میرا سر طلب کریں گی، اور مجھے معلوم تھا کہ خوجہ کو بھی اس کا کامل احساس ہے۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح ایک بار، سالوں پہلے، اس کو اپنے بارے میں گفتگو کرنے پر اکسانے کی خاطر، میں نے اپنے بچپن کے ایک دوست کا ذکر کیا تھا جس کے ساتھ میں نے ایک ہی وقت میں ایک جیسی چیز سوچنے کی عادت ڈال لی تھی۔ مجھے بالکل شک نہیں تھا کہ اس وقت وہ بھی ٹھیک یہی باتیں سوچ رہا تھا۔

اس شب بڑی رات گئے وہ سلطان کے خیمے میں گیا اور لگا جیسے کبھی نہیں لوٹے گا۔ چونکہ جو وہ حاکم سے کہنے والا تھا میں اس کا اندازہ بہ آسانی کرسکتا تھا، حاکم جو اس سے چاہے گا کہ دن کے واقعات اور مستقبل کی تعبیر پاشاؤں کے واسطے کرے، کچھ دیر تک میں اس امکان پر غور کرتا رہا کہ کھڑے کھڑے اس کی گردن ماردی گئی ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ جلاد مجھے لینے آئیں گے۔ بعد میں میں نے خیال کیا کہ وہ خیمے سے نکل گیا ہے اور، مجھے بتانے کے لیے توقف کیے بغیر، سیدھا اندھیرے میں جگمگاتے قلعے کے سفید برجوں کی طرف چلا گیا ہے، کہ چوکیداروں سے بچ نکل کر، دلدل سے گزر کر، جنگل پار کرکے وہ قلعے تک پہنچ گیا ہے۔ میں صبح

کے آنے کا انتظار کررہا تھا، بغیر کسی ولولے کے اپنی نئی زندگی کی بابت سوچ رہا تھا، کہ معاً وہ لوٹ آیا۔ بڑے عرصے کے بعد ہی، برسوں کے بعد، ان لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد جو اس رات سلطان کے خیمے میں موجود تھے، کہیں جاکر مجھے معلوم ہوا کہ خوجہ نے عین مین وہی کہا تھا جو میرا اندازہ تھا وہ کہے گا۔ اس وقت اس نے وضاحتاً کچھ بھی نہیں کہا، وہ اتنی پھرتی سے اِدھر اُدھر حرکت کررہا تھا جیسے کوئی سفر پر جانے کے لیے کرتا ہے۔ بولا کہ باہر ایک سخت دبیز دھند پھیلی ہوئی ہے۔ میں سمجھ گیا۔

دن نکلنے تک میں اس سے ان سب چیزوں کی بابت بات کرتا رہا جو میں اپنے پیچھے وطن میں چھوڑ آیا تھا، اسے بتایا کہ میرا گھر کیسے تلاش کرسکتا ہے، اپنی ماں، باپ، بھائی بہنوں کے بارے میں بتایا، ایمپولی اور فلورینس میں ہمیں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میں نے اسے چند چھوٹی چھوٹی، خاص باتوں سے آگاہ کیا جن سے وہ مختلف لوگوں میں تمیز کرسکتا تھا۔ یہ سب بتاتے وقت مجھے یاد آیا کہ میں پہلے بھی اسے یہی سب بتاچکا ہوں، حتیٰ کہ اس بڑے سے کالے تِل کی بابت بھی جو میرے چھوٹے بھائی کی کمر پر ہے۔ بعض اوقات، حاکم کی دل جوئی کرتے ہوے، یا اب یہ کتاب لکھتے ہوے، یہ کہانیاں مجھے اپنی فنطاسیوں کا عکس معلوم ہوتی ہیں، صداقت نہیں، لیکن اُس وقت میں ان پر یقین کرتا تھا: میری بہن کی ہکلاہٹ حقیقی تھی، جس طرح ہمارے لباسوں کے بہت سارے بٹن، اور وہ بہت سی چیزیں بھی جو مجھے کھڑکی سے اپنے گھر کے عقبی باغ میں نظر آئی تھیں۔ صبح کے قریب میں سوچنے لگا کہ میں ان کہانیوں کے بہکاوے میں آگیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ جاری رہیں گی، شاید اس مقام سے جہاں آکر رک گئی تھیں، اگرچہ بہت بعد میں ہی۔ مجھے معلوم تھا کہ خوجہ بھی یہی بات سوچ رہا ہے، کہ اسے بڑی خوشی سے اپنی کہانی پر یقین ہے۔

ہم نے ایک دوسرے کے کپڑوں کا بغیر جلد بازی اور بغیر کچھ کہے سنے تبادلہ کیا۔ میں نے اسے اپنی انگشتری اور وہ میڈیلین جو ان تمام سالوں اس سے بچائے رکھا تھا دیے۔ میڈیلین کہ اندر میری نانی کی ماں کی تصویر تھی اور میری منگیتر کے بالوں کی ایک لٹ جو وقت

کے ساتھ سفید پڑ گئی تھی؛ میرا خیال ہے وہ اسے پسند آیا، اس نے اسے اپنی گردن میں لٹکا لیا۔ پھر وہ خیمے سے نکلا اور چلا گیا۔ میں اسے پرسکوت دھند میں بتدریج غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ روشنی ہونے لگی تھی۔ نڈھال، میں اس کے بستر پر لیٹ گیا اور پرسکون نیند سو گیا۔

(۱۱)

اب میں اپنی کتاب کے اختتام تک پہنچ گیا ہوں۔ شاید تیز فہم قاریوں نے، یہ فیصلہ کر کے کہ میری کہانی درحقیقت بہت پہلے ہی ختم ہو گئی ہے، اس ایک طرف ڈال دیا ہو۔ برسوں پہلے میں نے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔ ان صفحات کو ایک دراز میں ڈال دیا تھا، اس قصد سے کہ انھیں اب دوبارہ کبھی نہیں پڑھوں گا۔ اُن دنوں میرا ارادہ ذہن کو ان دوسری کہانیوں کی طرف منتقل کرنے کا تھا جو میں نے اختراع کیں، سلطان کے لیے نہیں بلکہ اپنی لطف اندوزی کے لیے، معاشقے جنھوں نے ان سرزمینوں میں جنھیں میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا، اجاڑ بیابانوں اور برفانی جنگلوں میں جنم لیا، جن کا تعلق ایک حیلہ باز سوداگر سے تھا جو ان میں کسی بھیڑیے کی طرح گھومتا پھرتا؛ میں اِس کتاب کو فراموش کر دینا چاہتا تھا، اس کہانی کو۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ جو سُن چکا ہوں اور جس کا تجربہ کیا ہے، اس کے بعد ایسا کرنا آسان نہ ہوگا، میں شاید اس میں کامیاب بھی ہو گیا ہوتا اگر ایک مہمان دو ہفتے پہلے مجھ سے ملنے نہ آیا ہوتا اور مجھے اپنی کتاب باہر نکالنے پر قائل نہ کر لیتا۔ آج میں آخرکار یہ جان گیا ہوں کہ اپنی ساری کتابوں میں یہی وہ کتاب ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے؛ میں اسے اختتام تک پہنچاؤں گا جیسا کہ اسے پہنچنا چاہیے، جیسا کہ میں نے آرزو کی ہے، خواب دیکھا ہے۔

پرانی میز سے، جہاں بیٹھے میں اپنی کتاب ختم کر رہا ہوں، مجھے ایک ننھی سی بادبانی کشتی نظر آ رہی ہے جو سمندر کو جنت حصار سے استنبول کی طرف چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے، ایک پَن چکّی جو دور فاصلے میں زیتون کے باغوں میں چل رہی ہے، بچے جو باغ کی گہرائیوں میں انجیر کے درختوں کے نیچے کھیل میں دھکم پیل کر رہے ہیں، استنبول سے گیبزے جانے والی خاک آلود سڑک۔ بہار اور گرما میں مَیں مشرق کی طرف، اناطولیہ، حتیٰ کہ بغداد، اور دمشق جاتے ہوے کاروانوں کو دیکھتا ہوں؛ میں اکثر ان شکستہ بیل گاڑیوں کا نظارہ کرتا ہوں جو گھونگے کی سست رفتاری سے رینگ رہی ہوتی ہیں، اور بعض اوقات فاصلے میں کسی گھڑسوار کو دیکھ کر جس کی پوشاک کو میں پہچان نہیں پاتا میرا دل ولولے سے بھر جاتا ہے، لیکن جب وہ قریب آتا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آ رہا ہے۔ ان دنوں کوئی نہیں آتا، اور اب میں جانتا ہوں کہ کبھی کوئی آئے گا بھی نہیں۔

لیکن مجھے کوئی گلہ شکوہ نہیں، اور میں اکیلا نہیں ہوں: شاہی منجّمی کے زمانے میں میں نے اچھی خاصی رقم پس انداز کر لی تھی، میں نے شادی کی، میرے چار بچے ہیں؛ میں نے آنے والے رنج و محن کی پیش بینی کر لی تھی اور اپنے عہدے سے عین وقت پر سبکدوش ہو گیا تھا؛ شاید اس بصیرت کے سبب جو مجھے اپنے پیشے کے دوران حاصل ہوئی تھی: سلطان کی فوجوں کے ویانا کوچ کرنے سے پہلے، کاسہ لیس مسخروں اور میرے بعد آنے والے منجم کے سر شکست کے جنون میں قلم کر دیے جانے سے پہلے، جانوروں سے اتنی محبت کرنے والے ہمارے حاکم کے معزول کیے جانے سے بہت پہلے، میں فرار ہو کر یہاں گیبزے چلا آیا۔ میں نے یہ دیہی قیام گاہ تعمیر کروائی اور اپنی محبوب کتابوں، بچوں اور ایک دو ملازموں کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ میری بیوی، جس سے میں نے اپنی شاہی منجّمی کے زمانے میں شادی کی تھی، عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہے، بڑی اچھی خانہ دار ہے اور جو میرے واسطے سارے گھر کا انتظام اور چند چھوٹے موٹے اور کام بھی کرتی ہے، اور مجھے اپنی کتابیں لکھنے اور خواب دیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے، مجھے جو ستر برس کی عمر کو پہنچ رہا ہوں، سارا دن اس کمرے میں اکیلا پڑا رہتا ہوں۔ چنانچہ، اپنی کہانی اور

اپنی زندگی کے واسطے مناسب خاتمے کی تلاش میں، میں جی بھر کے اُس کے بارے میں سوچتا ہوں۔

تاہم اولین سالوں میں میں نے کوشش کی کہ ایسا نہ کروں۔ دو ایک مرتبہ اگر حاکم نے اُس کا ذکر چھیڑنا بھی چاہا تو اسے احساس ہو گیا کہ موضوع میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اسی پر قناعت کر لی تھی؛ اسے بس تجسس سا تھا؛ لیکن خاص طور پر کس چیز کے بارے میں، اور کس قدر، یہ میں کبھی دریافت نہ کر سکا۔ شروع میں اس نے کہا کہ مجھے اُس سے متأثر ہونے پر، اُس سے سیکھنے پر شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔ اسے آغاز ہی سے معلوم تھا کہ وہ تمام کتابیں، تقویمیں، اور پیش گوئیاں جو میں نے اسے برسہا برس تک پیش کی تھیں دراصل اُسی کی تصنیف تھیں، اور یہ اُس سے کہہ بھی دیا تھا حتیٰ کہ اس وقت بھی جب میں ہنوز گھر پر ہمارے ہتھیار کے خاکوں پر سر مار رہا تھا جو آخر الامر کیچڑ میں جا پھنسا؛ اسے یہ بھی معلوم رہا تھا کہ اُس نے مجھے یہ سب بتا دیا تھا، جس طرح میں بھی اُسے سب کچھ بتا دیتا تھا۔ تو شاید دھاگے کا سرا ہنوز ہم دونوں کے ہاتھ سے نہیں نکلا تھا، لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ سلطان کے قدم میرے مقابلے میں زمین پر زیادہ استقامت سے جمے ہوے ہیں۔ ان دنوں میں مجھے خیال آتا کہ حاکم مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے، ہر وہ چیز جانتا ہے جو اسے جاننی چاہیے اور مجھ سے صرف اپنا دل بہلا رہا ہے تاکہ مجھے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھ سکے۔ اور شاید میں اس تشکر کے دباؤ میں بھی تھا جو اس کے لیے یوں محسوس کرتا تھا کہ اس نے مجھے اس پسپائی سے بچائے رکھا تھا جس کا بیج دلدلی زمین میں بویا گیا تھا، اور سپاہیوں کی برافروختگی سے بھی جو عذاب کی افواہوں سے پاگل ہو گئے تھے۔ کیونکہ جب انھیں معلوم ہوا کہ کافر بھاگ نکلا ہے، تو چند سپاہ نے واقعی میرے سر کا مطالبہ کیا۔ اگر اولین سالوں میں سلطان نے مجھ سے بے تکلفانہ پوچھا ہوتا، تو مجھے یقین ہے کہ میں نے اسے کو ہر بات بتا دی ہوتی۔ ان دنوں ابھی یہ افواہ پھیلنی شروع نہیں ہوئی تھی کہ میں وہ نہیں تھا جو ہوں، میں کسی سے جو پیش آیا تھا اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا، مجھے اُس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

مجھے سے اطالیہ کی بابت پوچھا، وہ ملک جہاں وہ فرار ہوا تھا، اور میں نے جواب دیا کہ اس کی بابت بہت کم جانتا ہوں، تو وہ غصے میں آ گیا: اسے معلوم تھا کہ اُس نے مجھے ہر بات بتادی تھی، میں خوفزدہ کیوں تھا، بس اتنا ہی کافی تھا کہ جو اُس نے کہا تھا یاد رکھوں۔ چنانچہ میں نے سلطان کے واسطے بڑی تفصیل کے ساتھ دوبارہ اُس کے بچپن اور اُس کی دل فریب یادوں کو بیان کیا، جن میں سے کچھ میں نے اِس کتاب میں شامل کی ہیں۔ شروع میں میرا حوصلہ کافی مضبوط تھا، میرے حسبِ منشا سلطان میری بات سنتا — جیسے کسی کو وہی کہتے سن رہا ہو جو کسی اور سے سن چکا ہو — لیکن بعد کے سالوں میں اس سے بھی آگے نکل گیا؛ وہ میرے کہے کو اس طرح سننے لگا جیسے یہ وہ بیان کر رہا ہو: مجھ سے وہ جزویات معلوم کرتا جو صرف وہی جان سکتا تھا، مجھ سے کہتا کہ ڈروں نہیں، اور جو جواب ذہن میں سب سے پہلے آئے وہی دوں: وہ کیا واقعہ تھا جو اُس کی بہن کی ہکلاہٹ کا باعث بنا؟ پادوا کی دانش گاہ میں اُسے کیوں داخلہ نہیں ملا؟ وَینِس میں جو پہلا آتش بازی کا تماشا اُس نے دیکھا تھا تب اُس کے بھائی نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟ جب میں حاکم کو یہ تفصیلات یوں بتارہا ہوتا جیسے یہ مجھے ہی پیش آئی ہوں، تو اس وقت ہم پانی پر ایک دن گزار رہے ہوتے، یا کسی پوکھر کے پاس جو مینڈکوں اور سوسن سے کھچا کھچ بھرا ہوتا یا سیمیں پنجروں میں بے حیا بندروں کو دیکھتے ہوئے آرام کررہے ہوتے، یا ان میں کے کسی باغ میں چہل قدمی کررہے ہوتے جو، چونکہ یہاں ان دونوں نے کبھی سیر کی تھی، ان یادوں سے بھرا تھا جن میں وہ شریک رہے تھے۔ اُس وقت حاکم، میری کہانیوں اور باغوں میں کھلتے غنچوں کی مانند ہماری یادوں کی اٹھکھیلیوں سے دل شاد، خود کو مجھ سے قریب محسوس کرتا اور اُس کا ذکر کچھ اس طرح کرتا جیسے کسی ہم دمِ دیرینہ کو یاد کررہا ہو جو ہمیں دغا دے گیا ہو: بولا اچھا ہی ہوا جو وہ فرار ہوگیا، کیونکہ اُس کی باتوں میں دل بستگی محسوس کرنے کے باوجود اکثر موقعوں پر اُس کی گستاخی اس کا پیمانۂ صبر بھی لبریز کردیتی تھی اور اُس کو قتل کروا دینے کا خیال آتا۔ اس نے بعض ایسی باتیں بھی افشا کیں جن سے میں خوف زدہ ہوگیا کیونکہ میں ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکا کہ ہم دونوں میں سے کون اس کا موضوعِ بحث ہے، تاہم اس کے اندازِ

تکلّم میں اپنائیت تھی، تشدّد نہیں: ایسے دن بھی تھے جب، اُس کی خود ناشناسی کو ناقابلِ برداشت پاکر، اسے ڈر لگتا کہ عالمِ طیش میں کہیں اسے مَروا ہی نہ ڈالے — اُس آخری رات وہ بس جلاّد کو بلوانے ہی والا تھا! ازآں بعد، اس نے کہا کہ میں گستاخ نہیں تھا؛ میں دنیا میں خود کو سب سے زیادہ ہوشیار، سب سے زیادہ باصلاحیت نہیں گردانتا تھا؛ میں نے طاعون کی دہشت کی اپنے فائدے کے مطابق ترجمانی کی جسارت نہیں کی تھی؛ میں نے رات رات بھر ہر فرد و بشر کو ان طفل بادشاہوں کے قصوں سے بیدار نہیں رکھا تھا تھا جنھیں سولیوں پر چار چوب کیا گیا تھا؛ اور اب کوئی ایسا نہیں رہ گیا تھا جس کے پاس دوڑ کر جاؤں اور سلطان کے خواب سن لینے کے بعد انھیں دہراؤں اور ان کا مضحکہ اڑاؤں، کوئی بھی نہیں جس کے ساتھ مل کر اس کو گمراہ کرنے کے لیے احمقانہ اور فرحت بخش افسانے تراش سکوں! دورانِ سماعت مجھے خیال گزرا کہ اپنے کو، ہم دونوں کو، باہر سے دیکھ رہا ہوں، جیسے خواب میں، اور مجھے احساس ہوا کہ ہم دھاگے کا سِرا کھو بیٹھے ہیں۔ لیکن آخری مہینوں میں سلطان، جیسے مجھے پاگل کرنے پر تُلا بیٹھا ہو، اور بھی آگے بڑھ گیا: میں اُس کی طرح نہیں تھا، میں نے اُس کی طرح اپنا ذہن و ادراک سوفسطائیوں کے حوالے نہیں کردیا تھا جو ''ان میں'' اور ''ہم میں'' فرق کرتے تھے! آتش بازی کے دوران ہشت سالہ حاکم نے دوسرے کنارے سے تماشا دیکھا تھا جب اس کی ہم سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، میرا اپنا شیطان تیرہ و تاریک آسمان میں اُس کے واسطے اس دوسرے شیطان کی ظفرمندی کا باعث ہوا تھا، اور اب اُسی کے ہمراہ اُس دیس چلا گیا تھا جہاں اس کا خیال تھا کہ اسے امن و سکون مل جائے گا! بعد میں، باغ میں چہل قدمیوں کے دوران، جو ہمیشہ یکساں ہوتیں، حاکم متفکرانہ انداز میں پوچھتا: کیا یہ جاننے کے لیے کہ لوگ دنیا کے چاروں کونوں اور ساتوں اقلیموں میں ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں آدمی کا ایک سلطان ہونا ضروری ہے؟ ڈر کے مارے میں کوئی جواب نہیں دیتا؛ گویا مزاحمت کی میری آخری کوشش کو توڑنے کے ارادے سے وہ دوبارہ پوچھتا: کہ آدمی ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں، تو کیا یہ اس بات کا بہترین ثبوت نہیں کہ آدمی ہر جگہ ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں؟

کیونکہ مجھے امید تھی کہ سلطان اور میں ایک نہ ایک دن اُسے بھول جانے میں کامیاب ہوجائیں گے، اور کیونکہ میں نے مزید روپیا پیسا بچانے کی احتیاط بھی کرلی تھی، میں نے اس اذیّت کو صبروتحمل سے برداشت کیا ہوگا؛ کیونکہ میں ابہام کے ساتھ آنے والے خوف کا عادی ہوچلا تھا۔ وہ میرے ذہن کے دروازے کو بے رحمی سے کھولتا اور بند کرتا، جیسے کسی جنگل میں جہاں ہم اپنا راستا کھو بیٹھے ہوں کسی خرگوش کے تعاقب میں اِدھر اُدھر اپنا گھوڑا دوڑا رہا ہو۔ حد تو یہ کہ وہ اب ہر کس و ناکس کے سامنے یہ عمل دہرانے لگا تھا؛ وہ اب پھر اپنے قدموں میں لوٹنے والے چاپلوسوں کے نرغے میں تھا۔ مجھے ڈر لگا ہوا تھا کیونکہ مجھے گمان تھا کہ ایک اور اخراج (purge) عمل میں آئے گا جس کے نتیجے میں ہماری ساری املاک ضبط کرلی جائیں گی، اور کیونکہ مجھے ان مصائب کا احساس ہوگیا تھا جو جلد نازل ہونے والے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب اُس نے مجھ سے وَینِس کے پُلوں کی بابت بتانے کے لیے کہا تھا، اس دسترخوان کی کشیدہ کاری کی بابت جس پر وہ لڑکپن میں ناشتا کیا کرتا تھا، اُس کے گھر کے پچھواڑے باغ پر کھلنے والی کھڑکی سے آتے ہوئے منظر کی بابت جو اُسے اس وقت یاد آیا تھا جب اُس کا سر اسلام لانے سے انکار پر بس قلم کیا ہی جانے والا تھا—استنبول سے جس قدر جلد ہوسکے فرار ہونے کا فیصلہ میں نے ٹھیک اس وقت کیا جب سلطان نے مجھے ان تمام قصّوں کو ایک کتاب میں قلمبند کرنے کا حکم دیا تھا، گویا یہ سب جو مجھے پیش آیا تھا یہ اسی کی روداد ہو۔

میں گیبزے کی ایک مختلف رہائش گاہ میں اٹھ آیا تاکہ اُسے فراموش کرسکوں۔ پہلے مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ شاہی محل کے پہرے دار میری تلاش میں آتے ہوں گے، لیکن کوئی بھی میرے تعاقب میں نہیں آیا، اور میری آمدنی کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچی؛ یا تو مجھے بھلا دیا گیا تھا، یا پھر حاکم خفیہ طور پر میری نگرانی کروا رہا تھا۔ میں نے اس کی بابت مزید نہیں سوچا، اپنے کام کی شروعات کردی، یہ مکان تعمیر کروایا، اپنے حسبِ منشا، اپنی داخلی لہروں کے مطابق پائیں باغ لگوایا؛ میں اپنی کتابوں کے مطالعے میں وقت گزارتا، اپنی دل جوئی کے لیے قصّے کہانیاں لکھتا اور مجھ سے رجوع کرنے والے ملاقاتیوں کو صلاح مشورے دیتا کیونکہ انھیں پتا چل گیا تھا

کہ میں سابقہ منجم رہ چکا ہوں، اور یہ از راہِ تفنن زیادہ تھا، ان کی نقدی کے حصول کے لیے کم۔ شاید انھیں سے مجھے اپنے ملک کے بارے میں جہاں میں بچپن سے رہتا چلا آیا ہوں زیادہ واقفیت ہوئی: ہاتھ پاؤں سے معذوروں کی قسمت کے بارے میں بتانے سے پہلے، یا وہ لوگ جو بیٹے یا بھائی کی موت کے باعث گم سم ہوتے، وہ جو دائمی مریض ہوتے، ایسی لڑکیوں کے باپ جو شادی سے محروم رہ گئی ہوتیں، وہ جو اپنی پوری قامت کو پہنچنے سے قاصر رہے ہوتے، بدگمان شوہر، نابینا، ملاّح، اور متوحّش نگاہوں والے نراس عاشق، میں ان سے اپنی اپنی رام کہانی تفصیل کے ساتھ بیان کرواتا، اور دورانِ شب انھیں اپنی نوٹ بکس میں رقم کرلیتا تاکہ بعد میں اپنی کہانیوں میں استعمال کرسکوں، بالکل اسی طرح جس طرح اس کتاب میں کیا ہے۔

اُنھیں وقتوں میں میری ملاقات اس پیرِ فرتوت سے بھی ہوئی جو ایک عمیق محزونی کو اپنے ہمراہ لیے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھ سے دس، پندرہ سال بڑا رہا ہوگا۔ جوں ہی میرا سامنا اس آدمی کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی سے ہوا جو ایولیا [اولیاء][1] کہلاتا تھا، میں نے فیصلہ کرڈالا کہ اس کا مرض احساسِ تنہائی ہے، لیکن اس نے اس کا ذکر نہیں کیا: لگتا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی سیروسیاحت کے لیے وقف کردی تھی اور وہ جلدی کتابِ اسفار کے لیے جو بس اب ختم کرنے والا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرنے سے پہلے اس مقام کی زیارت کرے جو خدا سے قریب ترین ہے، مکّے اور مدینے کا سفر، اور ان کے بارے میں لکھنے کا بھی، بایں ہمہ اس کی کتاب میں کوئی کسر رہ گئی تھی جس نے اسے پراگندہ خاطر کردیا تھا، وہ اپنے قارئین کو اطالیہ کے فوّاروں اور پلوں سے بھی واقف کرانا چاہتا تھا جن کی خوبصورتی کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا، اور وہ خواہشمند تھا کہ کیا میں، جس کی سارے استنبول میں پھیلی ہوئی شہرت کی بنا پر وہ مجھ سے ملنے آیا تھا، ان کے بارے میں اسے بتاسکوں گا؟ جب میں نے متنبہ کیا کہ میں نے اطالیہ سرے سے کبھی دیکھا ہی نہیں تو بولا کہ یہ تو ہر متنفس کی طرح اسے بھی خوب معلوم ہے، پھر بھی سنا ہے کہ ایک بار میرے پاس ایک غلام ہوا کرتا تھا جو وہیں سے آیا تھا اور وہاں کی

---

[1] اولیاء چلیبی (اندازاً ۱۶۱۱ تا ۱۶۸۲) مشہور و معروف کتاب "سیاحت نامہ" کا مصنف۔—مترجم

ہر بات سے مجھے آگاہ کیا تھا؛ اب اگر میں وہی سب ایولیا سے بیان کروں، تو اس کے عوض وہ مجھے تفریحی حکایتیں سنائے گا: کیا دل بہلانے والے قصوں کی اختراع و سماعت زندگی کا خوشگوارترین حصہ نہیں؟ جب وہ بڑی کم آمیزی کے ساتھ اپنے ڈبے سے ایک نقشہ نکال رہا تھا، اطالیہ کا بدترین نقشہ جو میں نے کبھی دیکھا تھا، میں نے اسے وہ سب بتا دینے کا فیصلہ کر ڈالا جس کا وہ خواہشمند تھا۔

وہ اپنے بچکانے پھپّس ہاتھوں سے نقشے پر شہروں کی طرف اشارہ کرتا اور ان کے نام رکن رکن تلفظ کرتا جاتا اور بعد میں میرے دیے ہوئے بیان بڑی احتیاط سے لکھتا جاتا۔ ہر شہر کے بارے میں وہ کسی عجیب و غریب قصے کا خواہشمند بھی تھا۔ تیرہ شہروں میں تیرہ راتیں اسی طرح بسر کرتے ہوئے، ہم نے اس خطۂ زمین کو شمال سے جنوب تک پورے کا پورا طے کر ڈالا جسے میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا، پھر کشتی کے ذریعے سِسلی [صیقلہ] سے استنبول کو مراجعت کی۔ ہم نے پوری صبح اسی طرح گزاری۔ میں نے جو کچھ بیان کیا تھا اس پر وہ اتنا خوش ہوا کہ مجھے بھی خوش کرنے کا فیصلہ کر ڈالا، مجھے ان نٹوں کے قصے سنائے جو زمین سے اوپر تنے رسے پر چلتے ہوئے عکا (Acre) کے آسمانوں میں غائب ہو جاتے، قونیا کی وہ زن جس نے ہاتھی کو جنم دیا، ساحلِ نیل کے نیلے پردار بیل، گلابی بلّیاں، ویانا کا گھنٹہ گھر، آگے کے نقلی دانت جو اس نے وہاں وضع کیے تھے اور جن کی اب وہ اپنی ہنسی میں نمائش کر رہا تھا، بحرِ اَزاک (Sea of Azov) کے ساحل کا غار جس میں بات چیت کرنے کی صلاحیت تھی، امریکا کی سرخ چیونٹیاں۔ کسی سبب سے ان کہانیوں نے ایک عجیب سی افسردگی کو ابھارا، میرا دل رونے کو چاہا۔ غروبِ آفتاب کی سرخی سیلاب کی طرح میرے کمرے میں اُمڈ آئی۔ جب ایولیا نے پوچھا کہ کیا میرے پاس بھی ایسی ہی اچرت کہانیاں ہیں، تو مجھے اس کو واقعی حیرت زدہ کر دینے کا خیال آیا اور میں نے اسے اور اس کے خادم کو اپنے ہاں رات گزارنے کی دعوت دی: میرے پاس ایک ایسی کہانی ہے جو سچ مچ اسے دلشاد کر دے گی، دو افراد کے بارے میں جنھوں نے اپنی زندگیاں ادل بدل کر لی تھیں۔

رات کو جب سب اپنے اپنے کمروں کو سدھارے، جب وہ سکوت گھر پر اتر آیا جس کے ہم دونوں منتظر تھے، تو ہم دونوں کمرے میں لوٹ آئے۔ بس یہی پہلا موقع تھا جب میں نے اس کہانی کا تصوّر کیا جو آپ حضرات اب ختم کرنے والے ہیں! میں نے جو کہانی بیان کی وہ گھڑی ہوئی نظر نہیں آتی تھی بلکہ وہ جسے باقاعدہ گزارا گیا ہو۔ لگتا تھا جیسے کوئی اور شخص سہج سہج سے یہ الفاظ سرگوشی میں مجھ سے کہہ رہا ہو، آہستہ آہستہ جملے یکے بعد دیگرے ترتیب وار وارد ہو رہے ہوں: ”ہم کشتی میں سوار وَینِس سے نیپلز کی طرف جا رہے تھے کہ ترکی بیڑا نمودار ہوا...“

نصف شب کے بہت بعد، جب میری کہانی اپنی انتہا کو پہنچی، ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں ہی اُس کی بابت سوچ رہے ہیں، لیکن ایولیا کے تصور کا وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو میرے تصور میں سمایا ہوا تھا۔ مجھے بالکل شک نہیں کہ وہ درحقیقت اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا! اور میں، تو میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا، اُس کے بارے میں، کہ مجھے اپنی مخترع کہانی کس قدر عزیز تھی؛ اور مجھے ہر اس چیز پر فخر محسوس ہوا جو میں نے بسر کی تھی اور جس کا خواب دیکھا تھا: وہ کمرہ جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے، ہم دونوں جو کچھ کبھی بننا چاہتے تھے اور جو فی الحقیقت بنے تھے ان کی افسردہ یادوں سے چھلک رہا تھا؛ ٹھیک اسی وقت مجھے پہلی بار واضح طور پر سمجھ میں آیا کہ میں کبھی اُسے بھول نہیں سکوں گا، کہ یہ زندگی کے بقیہ ایام میں مجھے مغموم کر دے گا؛ ٹھیک تبھی مجھے معلوم ہوا کہ میں کبھی تنہا زندہ نہیں رہ سکوں گا: یوں تھا جیسے رات کے سناٹے میں، میری کہانی کے ہمراہ، کسی چِت چور واہمے کا سایہ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑ گیا ہو، ہمارے تجسّس کو بھڑکاتا ہوا، درایں اثنا ہمیں چوکنّا کرتا ہوا بھی۔ فجر کے قریب، میرے مہمان نے یہ کہہ کر میرا دل خوش کر دیا کہ اسے میری کہانی پسند آئی ہے، لیکن یہ کہ بعض بعض باتوں سے اختلاف کرنے پر بھی مجبور ہے۔ شاید اپنے توام کی ہاتھ پاؤں پھلا دینے والی یاد سے فرار حاصل کرنے کے لیے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اپنی نئی زندگی میں دوبارہ لوٹ آنے کے لیے، میں نے اپنی جملہ توجہ اسے دے دی۔

اس نے اتفاق کیا کہ ہمیں نامانوس اور حیران کن کی جستجو کرنی چاہیے، جیسا کہ میری کہانی میں ہوا تھا؛ ہاں، یہ واحد شے تھی جو ہم اس دنیا کی تھکا دینے والی بے کیفی کے توڑ کے طور پر استعمال کرسکتے تھے؛ کیونکہ یہ بات اسے بچپن اور اسکول کے اُن یک رنگی دنوں ہی سے معلوم تھی، اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی چاردیواری میں بند ہو بیٹھنے کی بابت نہیں سوچا تھا؛ اسی لیے اس نے اپنی ساری زندگی سفر کرنے میں بتا دی تھی، ان راہوں میں کہانیوں کی تلاش میں جو کبھی اپنی انتہا کو نہیں پہنچتیں۔ لیکن ہمیں نامانوس اور حیران کن کو دنیا میں تلاش کرنا چاہیے، اپنے اندرون میں نہیں! تلاشِ دروں، اپنے بارے میں طویل و عمیق غوروفکر ہمیں صرف رنجیدہ ہی کرسکتا ہے۔ اور یہی میری کہانی کے کرداروں کے ساتھ ہوا تھا: یہی وجہ تھی کہ سورما کبھی بھی اپنا آپا برداشت نہیں کرسکتے تھے، یہی وجہ تھی جو وہ ہمیشہ ہی کوئی دوسرا ہونا چاہتے تھے۔ چلیے باور کریں کہ جو میری کہانی میں پیش آیا وہ سچ تھا۔ کیا مجھے یقین تھا کہ وہ دو آدمی جنھوں نے ایک دوسرے کی جگہ لے لی تھی اپنی نئی زندگیوں میں خرسند ہوسکیں گے؟ میں گم سم رہا۔ بعد میں، کسی نہ کسی وجہ سے، اس نے مجھے میری کہانی کی ایک تفصیل یاد لائی: ہمیں خود کو کسی ایک ہاتھ والے ہسپانوی غلام کی امیدوں سے گمراہ ہوجانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے! کیونکہ اگر ہم نے یہ اجازت دے دی تو، رفتہ رفتہ، اس قسم کی کہانیاں رقم کر کے، خود اپنے دروں میں نامانوس اور حیران کن کی جستجو کے باعث، ہم بھی، کوئی دوسرا بن جائیں گے، اور معاذ اللہ، ہمارے قارئین بھی۔ وہ تو یہ سوچنے کا سزاوار بھی نہیں تھا کہ اگر ہر شخص صرف اپنے بارے میں ہی ہمیشہ کلام کرے، محض اپنے خصائص کے بارے میں ہی، کہ اس کی تصانیف اور کہانیاں ہمیشہ صرف اسی کے بارے میں ہوں، تو دنیا کتنی بھیانک ہوجائے گی۔

لیکن میں یہ کرنا چاہتا تھا! چنانچہ جب اس چھوٹے سے پیرمرد نے، جس سے مجھے ایک ہی دن میں اس قدر والہانہ قربت پیدا ہوگئی تھی، اثنائے فجر اپنے خدّام کو سفرِ مکّہ کے لیے اکھٹا کیا، اور راہ پکڑی، تو میں فوراً جم کر بیٹھ گیا اور اپنی کہانی لکھ ڈالی۔ آنے والی بھیانک دنیا میں اپنے قارئین کی خاطر میں نے کہانی میں خود کو اور اُسے، جسے میں اپنے سے علاحدہ نہ کرسکا، حتی

المقدور زندہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن حال ہی میں، اس چیز کو بارِ دگر دیکھتے ہوئے جسے میں نے سولہ سال پہلے ایک طرف ڈال دیا تھا، مجھے خیال آیا کہ میں اپنی کوشش میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوا ہوں۔ تو میں اپنے اُن قارئین سے معذرت خواہ ہوں جنھیں آدمی اپنی ہی ذات کے بارے میں گفتگو کرتا ہوا پسند نہیں آتا— خاص طور پر جب وہ ایسے پراگندہ کردینے والے جذبات میں آ پھنسا ہو— اور ان صفحات کا اپنی کتاب میں اضافہ کرتا ہوں:

مجھے اُس سے محبت تھی، اتنی ہی محبت جتنی مجھے اپنی ذات کے بے یارومددگار، بدبخت سایے (ghost) سے تھی جو مجھے اپنے خوابوں میں نظر آتا تھا، گویا اس سایے کے ننگ، طیش، عصیاں، اور غمگینی پر میرا دم گھٹا جارہا ہو، گویا اس ندامت سے مغلوب ہوگیا ہوں جو کسی وحشی جانور کو تکلیف سے مرتے دیکھنے کے منظر سے محسوس ہو، یا لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اپنے سپوت کی خودغرضی کے باعث طیش میں آ گیا ہوں۔ اور شاید اس سے بھی زیادہ یہ کہ مجھے اپنی ذات کو جاننے کے احمقانہ اکراہ اور احمقانہ مسرّت کے ساتھ اُس سے محبت تھی؛ اُس سے میری محبت میرے اس طور سے مشابہ تھی جس میں مَیں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی بے ثمر حشرات الارض جیسی حرکات کا عادی ہوگیا تھا، جس طور پر میں ان خیالات کو سمجھتا تھا جو ہر روز میرے ذہن کے درودیوار کے مقابل گونجتے اور فنا ہوجاتے، جس طور میں اپنے بدبخت جسم کے پسینے کی منفرد بو پہچانتا تھا، اپنے جھڑتے ہوئے بال، کریہہ المنظر منھ، قلم سنبھالے ہوئے گلابی ہاتھ۔ جب میں اپنی کتاب لکھ چکا اور اسے، اس امید میں کہ اب اُسے بھول جاؤں گا، ایک طرف ڈال دیا، کبھی بھی گردش کرتی ہوئی کسی افواہ سے دھوکے میں نہیں آیا، ان لوگوں کے کھیل تماشے جنھوں نے ہماری شہرت کا سن رکھا تھا اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے— بالکل نہیں! قاہرہ کے کسی پاشا نے اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور اب وہ ایک نئے ہتھیار کے خاکے بنا رہا تھا! ناکام رہ جانے والے محاصرے کے دوران وہ ویانا شہر میں اندرونِ فصیل تھا، جہاں وہ دشمنوں کو بتا رہا تھا کہ ہمیں کس طرح شکستِ فاش دی جاسکتی ہے! فقیر کے بھیس میں اَیدرنہ میں دکھائی دیا تھا، اور سوداگروں کے ایک آپسی جھگڑے کے دوران جسے خود اُسی نے کروایا

تھا، ایک رضائی بنانے والے کو چاقو مار کر رفوچکر ہو گیا تھا! اناطولیہ کے ایک دورافتادہ گاؤں کی مقامی مسجد کا امام تھا، اُس نے ایک کلاک روم کا انتظام کیا تھا— جو لوگ یہ قصہ بیان کرتے تھے اس کے سچ ہونے کی قسم کھاتے تھے؛ اور اب تو اُس نے ایک گھنٹہ گھر کی تعمیر کے لیے پیسا اکھٹا کرنا بھی شروع کر دیا تھا! وہ ہسپانیہ میں، جہاں وہ طاعون کے تعاقب میں پہنچا تھا، کتابیں لکھ لکھ کر متموّل ہو گیا تھا! ان کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ اُسی نے سازش کر کے ہمارے بے چارے حاکم کو تخت سے اتروایا تھا! وہ سلاو دیہاتوں میں فروکش تھا، جہاں ایک افسانوی حیثیت کے حامل مرگی زدہ کاہن کی طرح اُس کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی تھی، جہاں سچے اعترافات جو وہ انتہائے کار کروا سکا تھا، ان پر مبنی حزن و یاس سے مملو کتابیں لکھ رہا تھا! وہ اناطولیہ کے گرد و نواح میں کہتا پھر رہا تھا کہ ان بے وقوف سلطانوں کا تختہ اُلٹ دے گا، اپنی قیادت میں ایک ٹولی کو لیے لیے جسے اُس نے اپنی پیش گوئیوں اور شاعری سے مسحور کر دیا تھا، اور مجھے شمولیت کے لیے بلا رہا تھا! ان سولہ برسوں میں جب میں کہانیاں لکھ رہا تھا، تاکہ اُسے بھلا سکوں، تاکہ ان دہشت ناک لوگوں اور ان کی دہشت ناک آئندہ دنیاؤں سے اپنی توجہ ہٹا سکوں، اپنی فنطاسیوں کی جملہ لذّتوں سے متمتع ہو سکوں، میں نے ان افواہوں کو مختلف شکلوں میں سنا، لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی یقین نہیں کیا۔ مجھے معلوم نہیں، میں حیرت سے سوچتا ہوں کہ یہ دوسروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے: بسا اوقات، جب ہم گولڈن ہارن کی دور دراز حدوں کی اس چار دیواری میں خود کو محبوس محسوس کرتے، بسا اوقات، کسی حویلی یا محل سے دعوت نامے کے منتظر جو کبھی آ کر نہ دیتا، اس نفرت سے جو ہمیں ایک دوسرے سے تھی اس سے کسب لذّت کرتے ہوئے، یا دانت نکال کر ایک دوسرے پر ہنستے ہوئے درحالے کہ اپنے حاکم کے واسطے ایک اور رسالہ تصنیف کر رہے ہوتے، روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں، ایک ہی لمحے، ہم دونوں کی توجہ ایک ہی تفصیل پر آ جمتی: ایک بھیگا ہوا کتا جسے ہم نے اس صبح بارش میں دیکھا تھا، دو پیڑوں کے درمیان تنی ہوئی کپڑے سکھانے کی رسّی کے رنگوں اور شکلوں میں پوشیدہ ہیئتیں (جیومیٹری)، زبان کی چوک جو ناگہانی زندگی کی موزونیت کا ابراز کرتی! یہ وہ لمحات ہیں جن کی

کمی میں شدت سے محسوس کرتا ہوں! اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے سایے کی کتاب کی طرف لوٹا ہوں، یہ تصور کرتے ہوئے کہ کوئی متجسّس شخص برسوں بعد، شاید اُس کی موت کے صدیوں بعد اسے پڑھے گا، اور خود اپنی زندگی کا تصور کرے گا نا کہ ہماری؛ یہ کتاب جسے اگر کوئی کبھی بھی نہ پڑھے تو مجھے واقعی اس کی پروا نہ ہوگی، اور اس کے اندر جہاں میں نے اُس کا نام چھپایا ہے، دفن کیا ہے، اگرچہ بہت گہرا نہیں: تاکہ میں مزید ایک بار طاعون کی راتوں کا خواب دیکھ سکوں، اَیدرنہ میں اپنے بچپن کا، سلطان کے باغات میں جو طرب انگیز گھڑیاں گزاری تھیں ان کا، پہلی مرتبہ جب میں نے اُسے داڑھی منڈا پاشا کے دروازے پر دیکھا تھا اس کا، اپنی پشت پر نیچے کی طرف رینگتی ہوئی ٹھنڈک کا۔ زندگی اور وہ خواب جو ہم نے کھو دیے تھے انھیں بارِ دگر دسترس میں لایا جائے، ہر فرد و بشر ان چیزوں کے خواب دوبارہ دیکھنے کی ضرورت کو سمجھتا ہے: مجھے اپنی کہانی پر یقین تھا!

میں اپنی کتاب اس دن کے ذکر پر ختم کروں گا جس میں میں نے اسے مکمل کرنے کا فیصلہ کیا: دو ہفتے پہلے، جب میں دوبارہ اپنی میز کے سامنے بیٹھا، اس کوشش میں کہ ایک مختلف کہانی گھڑوں، میں نے استنبول کی سڑک سے ایک سوار کو آتے دیکھا۔ حال میں کسی نے بھی مجھے اُس کی خیر خبر نہیں پہنچائی تھی، شاید اس لیے کہ میں اپنے ملاقاتیوں سے اتنی روکھائی سے پیش آتا تھا کہ مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اب اور مجھ سے ملنے آئے گا، لیکن جیسے ہی میری نظر اس مسافر پر پڑی جو ایک بے آستین کا لبادہ پہنے اور ہاتھ میں دھوپ کی چھتری سنبھالے ہوئے تھا، مجھے پتا چل گیا کہ وہ مجھی سے ملنے آ رہا ہے۔ میرے کمرے میں اس کے داخل ہونے سے قبل ہی مجھے اس کی آواز سنائی دی، وہ ترکی بول رہا تھا اور اس میں اُسی کی سی غلطیاں کر رہا تھا، لیکن اتنی زیادہ نہیں جن کا وہ مرتکب ہوتا تھا، لیکن میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اطالوی بولنا شروع کر دی۔ جب اس نے میرے چہرے کو بگڑتے دیکھا اور یہ کہ میں جواب نہیں دے رہا ہوں، تو اس نے اپنی اُنگھڑ ترکی میں کہا کہ اس کا خیال تھا کہ میں کم از کم تھوڑی سی اطالوی ضرور جانتا ہوں گا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اسے میرا نام اور کہ کیا

ہوں اُسی سے معلوم ہوا تھا۔ اپنے ملک لوٹنے کے بعد اُس نے پشتارہ بھر کتابیں لکھ ڈالی تھیں جن میں ترکوں کے ہاں اپنی ناقابلِ یقین مہم جوئیوں کا ذکر کیا تھا، ان کے آخری حاکم کے بارے میں لکھا تھا جسے جانوروں اور اپنے خوابوں سے کس قدر والہانہ عشق تھا، طاعون اور ترک لوگوں کے بارے میں، ہمارے درباری اور جنگی آداب کے بارے میں۔ طرفہ تماشا مشرق (exotic Orient) کے بارے میں تجسّس جو روئسا اور خاص طور پر شائستہ خواتین میں پھیلنا بس شروع ہی ہوا تھا، اُس کی نگارشات ہاتھوں ہاتھ لی گئیں، خوب خوب پڑھی گئیں، اُس نے یونی ورسٹیوں میں لیکچر دیے، اور مالدار بن گیا۔ مزید یہ کہ اُس کی سابقہ منگیتر نے، اُس کی نگارشات کی رومانیت میں بہہ کر، اس سے چٹ پٹ بیاہ کرلیا، نہ اپنی عمر کا کچھ خیال کیا، نہ اپنے شوہر کی حالیہ موت کا۔ انھوں نے پرانا آبائی مکان، جس کے بخرے کرکے بیچ دیے گئے تھے، واپس خریدا اور اس میں آ بسے، اور گھر اور اس کے باغ کو اپنی سابقہ حالت میں لے آئے۔

میرے مہمان کو ان باتوں کا پتا تھا، اس لیے کہ اُس کی کتابوں سے اپنی گرویدگی کے باعث وہ وہاں جاکر اُس سے مل آیا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے پیش آیا، ملاقاتی کے لیے اپنا پورا دن وقف کردیا اور اس کے سوالوں کا جواب دیا، ازسرِ نو ان مہم جوئیوں کی بازخوانی کی جو اُس نے اپنی کتابوں میں قلمبند کی تھیں۔ اسی موقعے پر اُس نے تفصیل کے ساتھ میرا ذکر کیا تھا: ''میرا ایک ترک شناسا'' کے عنوان سے وہ میرے بارے میں ایک کتاب لکھ رہا تھا؛ وہ اپنے اطالوی قارئین کے سامنے میری پوری زندگی پیش کرنے ہی والا تھا، اَیدرنہ میں میرے بچپن سے لے کر اس دن تک کی زندگی جب اُس نے کوچ کیا تھا، اور جس میں ترکوں کی انوکھی عادات اور خصلتوں کے بارے میں ہوشیاری سے لکھی ہوئی اپنی ذاتی تشریحات و توضیحات سے کام لیا تھا۔ ''آپ نے اُسے اپنے بارے میں اتنا بہت بتایا تھا!'' میرے مہمان نے کہا۔ بعد میں، میرے تجسّس کو مزید شہ دینے کی خاطر، اس نے کتاب کا جتنا کچھ بھی پڑھا تھا اس سے جزئیات نکال نکال کر بیان کرنا شروع کیں: محلے کے بچپن کے دوستوں میں سے ایک کو بے رحمی سے زدوکوب کرنے کے بعد میں کتنا پشیمان ہوا تھا اور تأسف سے رو پڑا تھا، میں ذہین تھا، چھ ماہ ہی

میں اُس کی پڑھائی ہوئی ساری فلکیات سمجھ لی تھی، مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت تھی، میں اپنے مذہب کا گرویدہ تھا، عبادت باقاعدگی سے کرتا تھا، چیری کے مربّوں کا شائق تھا، مجھے رضائی سازی سے، جو میرے سوتیلے باپ کا پیشہ تھی، خصوصیت سے دلچسپی تھی، تمام ترکوں کی طرح خلق و بشر سے پیار کرتا تھا، وغیرہ، وغیرہ۔ جب اس نے میری ذات میں اس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کیا، تو میں جان گیا کہ میں اس الّو کے ساتھ بے تواضعی کا سلوک نہیں کرسکتا اور یہ کہ اس جیسے سیاح کے لیے دلچسپی لینا ناگزیر ہے، چنانچہ میں نے اسے کمرہ کمرہ اپنا گھر دکھایا۔ بعد میں وہ ان کھیلوں سے مسحور ہوگیا جو باغ میں میرے بیٹے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہے تھے: اس نے ''گلّی ڈنڈے'' اور ''آنکھ مچولی'' کے قواعد ان سے پوچھ پوچھ کر ایک نوٹ بک میں درج کیے، اور ''مینڈک پھاند'' (leapfrog) کے بھی، گو یہ کھیل اسے کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آیا۔ ٹھیک اسی وقت اس نے بتایا کہ وہ ترکوں کا پرستار ہے۔ جب میں اسے ہمارا باغ دکھا رہا تھا، کہ کرنے کے لیے اس سے بہترے کچھ اور تھا ہی نہیں، اور بعد ازاں گیبزے کا خستہ و بدحال شہر اور وہ گھر جہاں سالوں پہلے میں اُس کے ساتھ اقامت گزیں تھا، تو اس نے پھر کہا۔ جب ہم پینٹری کا معائنہ کررہے تھے، مربّوں اور اچاروں کے مرتبانوں، زیتون کے تیل اور سرکے کے ظروف کے درمیان، جن سے اسے ایک گونہ دلچسپی تھی، اس کی نظر میری روغنی تصویر پر جاپڑی جو میں نے وینس کا ایک پینٹر سے آڈر دے کر بنوائی تھی، اس نے مجھے مزید اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا، جیسے کسی راز کا افشا کررہا ہو، کہ سچ پوچھیں تو وہ ترکوں کا حقیقی دوست نہیں تھا، کہ اُس نے ان کے بارے میں ناگوار باتیں لکھیں تھیں: اُس نے تحریر کیا تھا کہ اب ہم حالتِ زوال میں ہیں، ہمارے دماغوں کا یوں ذکر کیا تھا جیسے یہ بوسیدہ کاٹھ کباڑ سے بھری غلیظ الماریاں ہوں۔ اُس نے کہا تھا کہ ہم ناقابلِ اصلاح ہیں، کہ اگر باقی بچ رہنا چاہتے ہیں تو واحد چارہ یہی ہے کہ فی الفور سپر انداز ہوجائیں، اور اس کے بعد ہم صدیوں تک کچھ کرنے کے اہل نہیں رہیں گے الّا یہ کہ جن کے سامنے سپر انداز ہوے ہیں بس ان کی نقّالی کیے جائیں۔ ''لیکن وہ ہمیں بچانا چاہتا تھا،'' میں نے کہا، اس امید کے ساتھ کہ وہ بس کرے، اور اس نے فوری جواب دیا کہ ہاں،

ہماری خاطر اُس نے ایک ہتھیار تک بنا ڈالا تھا، لیکن ہم اُسے سمجھے کہاں تھے؛ وہ مشین جو اُس نے وضع کی تھی، ایک کہر آلود صبح طوفان میں اٹکی کسی بحری قزاقوں کی سیرت ناک کشتی کے لاشے کی طرح ایک نفرت انگیز دلدل میں پھنسی چھوڑ دی گئی تھی۔ پھر اس نے اضافہ کیا: ہاں، اس میں کلام نہیں کہ وہ ہمیں واقعی بچانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ شر سے بالکل ہی عاری تھا۔ ہر قوتِ مخترعہ (genius) اسی طرح ہوتی ہے! میری تصویر کو، جو دوراں اثنا اس نے اٹھالی تھی، بنظرِ غائر دیکھتے ہوئے وہ قوتِ مخترعہ کے بارے میں مزید چند باتیں بڑبڑایا: اگر وہ ہماری غلامی میں نہ آپھنسا ہوتا بلکہ خود اپنے ہی ملک میں اُس نے زندگی گزاری ہوتی، تو ہوسکتا ہے کہ وہ سترھویں صدی کا لیونارڈو ثابت ہوتا۔ بعد ازاں اس نے اپنے محبوب موضوع ''شر'' کی طرف مراجعت کی، ایک دو گتھیں اُس کے اور روپے پیسے کے حوالے سے دُہرائیں جو میں نے پہلے سے سن رکھی تھیں لیکن تبھی سے بھلا بھی بیٹھا تھا۔ ''تعجب کی بات تو یہ ہے،'' اس نے بعد میں کہا، ''کہ تم پر اُس کا ذرا اثر نہیں ہوا ہے!'' اس نے کہا کہ وہ مجھے جان گیا ہے اور مجھ سے محبت بھی کرتا ہے؛ اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا: دو آدمی جو اتنے سال ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہوں آخر ایک دوسرے سے اتنے کم مشابہ کیسے ہوسکتے ہیں، ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیسے ہوسکتے ہیں، وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس نے میری تصویر نہیں مانگی، جیسا کہ مجھے خدشہ تھا کہ مانگ بیٹھے گا؛ اسے اپنی جگہ پر لوٹاتے ہوئے اس نے پوچھا کہ کیا رضائی گدّے دیکھ سکتا ہے۔ ''کون سے رضائی گدّے؟'' میں نے حواس باختہ کہا۔ اسے حیرت ہوئی: میں اپنا فالتو وقت رضائیاں ٹانکنے میں نہیں خرچ کرتا تھا؟ تبھی میں نے اسے وہ کتاب دکھانے کا فیصلہ کر ڈالا جسے میں نے سولہ سال سے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

اس پر وہ مضطرب ہوگیا، بولا کہ ترکی پڑھ سکتا ہے، اُس کے بارے میں میری نوشتہ کتاب سے اسے واقعی دلچسپی ہے۔ ہم اوپر میرے کام کرنے کے کمرے میں آئے جہاں سے باغ نظر آتا تھا۔ وہ ہماری میز کے سامنے آ بیٹھا، اور میں نے اپنی کتاب وہیں پائی جہاں اسے، جیسے یہ کل ہی کی بات ہو، میں نے سولہ سال قبل اسے ڈال دیا تھا؛ میں نے اسے کھول کر اس

کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ترکی پڑھ لی، گرچہ آہستہ آہستہ۔ اس نے خود کو کتاب میں دفن کر دیا، اپنی باہوش اور متحول دنیا کو چھوڑے بغیر اس میں غرق ہو جانے کی اسی خواہش کے ساتھ جو مجھے تمام سیاحوں میں نظر آتی تھی، اور جسے میں حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میں باہر باغ میں آیا اور بھوسے کی اپ ہولسٹری والے دیوان پر آ بیٹھا جہاں سے میں کھلے دریچے سے اسے دیکھ سکتا تھا۔ شروع شروع میں وہ بشاش نظر آیا، مجھے پکار کر بولا، ''صاف ظاہر ہے کہ تم نے اطالیہ میں کبھی قدم نہیں دھرا!'' لیکن جلد ہی وہ مجھ سے غافل ہو گیا؛ میں تین گھنٹے باغ میں بیٹھا رہا، جب تب آنکھ کے گوشے سے اوپر دیکھ لیتا، اس انتظار میں کہ وہ کتاب ختم کر لے۔ اس وقت تک وہ سب سمجھ چکا تھا، اگرچہ اس کے چہرے سے الجھن مترشح تھی؛ ایک دو بار اس نے آواز سے سفید قلعے کا نام لیا جو اس دلدل کے عقب میں تھا جو ہمارے ہتھیار کو ہڑپ کر گئی تھی؛ اس نے بے سود مجھ سے اطالوی بولنے کی کوشش کی۔ پھر وہ مڑا اور خالی خالی نظروں سے کھڑکی کے باہر گھورنے لگا، جیسے ستا رہا ہو اور جو پڑھا تھا اسے ہضم کرنے کی کوشش۔ میں نے لطف اندوزی سے اسے خلا میں کسی لامتناہی نقطے (point) کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا، جیسا کہ لوگ ایسی صورت حال میں کیا کرتے ہیں، کسی ناموجود نقطۂ ماسکہ (فوکل پوائنٹ) کی طرف، لیکن پھر، پھر، جیسا کہ مجھے توقع تھی، اس کی بصارت ماسکے میں آ گئی: اب وہ کھڑکی کے چوکھٹے سے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے زیرک قارئین یقیناً سمجھ گئے ہوں گے: وہ اتنا گاؤدی نہیں تھا جتنا میں نے فرض کر لیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق، وہ میری کتاب کے ورق بڑے حریصانہ اشتیاق سے جلدی جلدی پلٹانے لگا، متلاشی، اور میں بے قراری سے انتظار کرتا رہا تا آنکہ انتہائے کار اسے وہ صفحہ مل گیا جسے ڈھونڈ رہا تھا اور پڑھ ڈالا۔ پھر اس نے بارِ دگر کھڑکی سے میرے گھر کے عقبی باغ کو دیکھا۔ مجھے بالکل ٹھیک معلوم تھا کہ اسے کیا نظر آ رہا تھا۔ میز پر رکھی قزح رنگ سیپوں سے مرصع کشتی میں پڑے آڑو اور چیریاں، میز کے عقب میں ایک دیوان جس کی اپ ہولسٹری پھونس کی مونج سے بُنی ہوئی تھی اور جس پر بکھرے ہوئے بال و پر سے بھرے تکیوں کا رنگ کھڑکی کے چوکھٹے جیسا سبز تھا۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، اب تقریباً ستر سال

ہمارا واٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زیل میں ہیں

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شان دار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارے واٹس ایپ گروپ میں شامل ہونے کے لیے

محمد ذولقرنین حیدر03123050300

پروفیسر سدرہ ریاض صاحبہ03340120123

محمد ثاقب ریاض03447227224

کا۔ اور پیچھے، زیتون اور چیری کے درختوں کے درمیان کنویں کی جگت پر اسے ایک گوریا براجمان نظر آرہی تھی۔ اخروٹ کی ایک بلند شاخ سے لمبی سی رسّی سے بندھا جھولا بمشکل محسوس ہونے والی ہوا میں ہولے ہولے ڈول رہا تھا۔

١٩٨٤—١٩٨٥
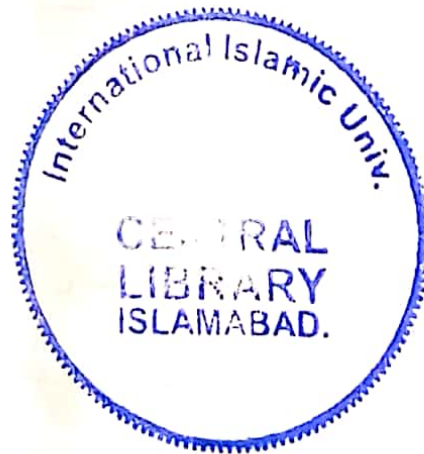
آقا کون ہے اور غلام کون؟

عالم کون ہے اور قیدی کون؟

میں کہاں تک ہوں اور وہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

مشرق سے مغرب تک یہ سوال گونج رہے ہیں۔ انہیں سوالوں سے اورحان پامک نے اپنا یہ ناول تعمیر کیا ہے۔ یہ ناول مشرق اور مغرب کے امتزاج، شناخت کے مسائل اور انسانی رشتے ناتوں کے پیچاک کو بڑی خوب صورتی سے اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ تاریخ کے صفحات سے نکلی ہوئی یہ کہانی بہت پرانی ہے مگر مصنف کے حیرت انگیز اسلوب نے اس کہانی کو جدید انداز کا حامل بنا دیا ہے۔

اورحان پامک کا تعلق ترکی سے ہے۔ اپنی ابتدائی چند کتابوں کے بعد سے وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہو گیا۔ اُس کے ناول دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اردو میں اورحان پامک کا ناول پہلی بار کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔
اورحان پامک کو ۲۰۰۶ء میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔

اس ترجمے کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محمد عمر میمن کے قلم سے نکلا ہے۔ انہوں نے جدید اردو افسانوں کے کئی مجموعے انگریزی میں بڑی کامیابی کے ساتھ منتقل کیے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے بین الاقوامی ادب کو اردو میں متعارف کرانے کے لیے تراجم کا بیڑا اٹھایا ہے جو "کلاسیک" کے سلسلے کے تحت زیر اشاعت ہیں۔

شہرزاد
SCHEHERZADE

ISBN: 978-969-8636-80-3
9 789698 636807
Price Rs. 160/-